تقابل ادیان کے موضوع پر ایک لاجواب تحقیقی رسالہ

بنام

اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ

مؤلف:

محمد ابراہیم رضا چترویدی، نیپال

ناشر

ISLAM AUR DEEGAR MAZAHIB KA TAQABULI JAYEZA

By: Muhammad Ibrahim Raza Chaturvedi, Nepal

صدائے دل نوائے شوق

''بہار ڈیولپمنٹ مسلم اکیڈمی'' ایک عصری دینی تعلیمی ادارہ ہے، جس کا مقصد ہندو نیپال میں بسنے والے شہریوں بالخصوص مسلم بچے بچیوں کے اعلی تعلیمی وتربیتی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ پسماندہ آبادیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرکے ترقی کی دوڑ میں شامل کرنا ہے۔ جہالت وناخواندگی کی دبیز چادر کو چاک کر کے قوم مسلم کو ملک کا مہذب اور تعلیم یافتہ شہری بنانا ہے۔ یہاں بہار بورڈ کے نصاب کے مطابق کالج سطح کی تعلیم کا بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ مسلم بچے بچیوں کو حافظ قرآن وعالم دین بنا کر ڈاکٹر، انجینئر، آئی ایس، آئی پی ایس (سیول سروسز) کے امتحانات میں بیٹھنے کے قابل بنانا ہے۔

آپ تمامی دردمند وغیور مسلمانوں سے اپیل ہے کہ بہار ڈیولپمنٹ مسلم اکیڈمی میں اپنے بچوں کا داخلہ کرائیں نیز اس ادارے کا ہر ممکن مالی تعاون کر کے معاشرہ کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

(نوٹ) عنقریب یہ مسلم اکیڈمی مسلم کالج میں تبدیل ہو جائے گا۔ زمین کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ چند مہینوں میں تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ انشاءاللہ!

فقط والسلام

محمد ابراھیم رضا چترویدی

فاونڈر بہار ڈیولپمنٹ مسلم اکیڈمی مظفر پور بہار

منجانب: العنسی ایجوکیشنل سوسائٹی مظفر پور بہار

AL ANASI EDUCATIONAL SOCITY MUZAFFARPUR
Pin 842004 BIHAR mo 9031112974

Printed at: Ahmad Publications Pvt. Ltd., Mob.: 8521889323

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقابل ادیان کے موضوع پر ایک لاجواب تحقیقی رسالہ

بنام

اسلام

اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ

مؤلف:

محمد ابراہیم رضا چترویدی

ناشر:

احمد پبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹیڈ) سبری باغ، پٹنہ ۴

نام کتاب : اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ

مؤلف : محمد ابراہیم رضا چترویدی جھٹکوھیا دھنوشا نیپال

حسب فرمائش : خطیب الہند مفتی علامہ ضیاء الدین کٹک اڑیسہ
ومدح خوان مصطفی مولانا غلام مصطفی سراجی مظفرپوری

نظر ثانی : مفتی محمد رضا مرکزی ازہری بنارس یوپی

باہتمام : شہزادہ مؤلف عزیزم فیضان رضا عطاری جھٹکوھیا

کمپوزنگ : محمد امجد رضا امجد امجدی کمپیوٹر مرغیا چک سیتامڑھی
موبائل:8986026210

ناشر : احمد پبلیکیشنز (پرائیویٹ لمیٹیڈ) سبری باغ، پٹنہ ۴

صفحات :

تعداد بار اول : ایک ہزار

سن اشاعت : 2024

قیمت : 150/روپے

ملنے کے پتے:

☆ قادری کتاب گھر، دامودر پور مظفرپور بہار

☆ العنسی ایجوکیشنل سوسائٹی مظفرپور9546706329

☆ رضا بک سیلر کمپنی باغ مظفرپور

☆ جامعۃ المدینہ عائشہ للبنات بلہی دھنوشا نیپال9807806183

فہرست

□□□

شرف انتساب

اُن اکابرین جامعہ کے نام جن کی بے لوث خدمات کے سبب آج جامعہ پھل پھول رہا ہے اور بالخصوص والد گرامی محمد عنسی اور والدہ محترمہ رشیدہ خاتون کے نام جن کی دلی دعاؤں نے ہمیں اس قابل بنایا۔

محمد ابراہیم رضا چترویدی

تقریظ جمیل

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امابعد!

کتاب ''اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ'' نظر نواز ہوئی، طائرانہ مطالعہ کیا۔ اس کتاب میں علاوہ اسلام کے دیگر ۹؍ادیان کا جو تذکرہ کیا گیا ہے اوران کے اساسی قوانین کوزیر بحث لاکران کے منفی نتائج (جوانسانی زندگی پہ اثر انداز ہوگئے ہیں) کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پھر اخیر میں اسلام اور اس کے آفاقی قوانین پھر ان کے مثبت نتائج (جو حیات انسانی کے لیے صالح معاشرے کی تشکیل کتنے ضروری ولابد ہیں) کوسمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً اس کتاب کو پڑھ کر ہر منصف مزاج نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اسلام ہی وہ دین رحمت ہے جس کے دامن میں بھٹکتی روحوں کا قرار منزل، سسکتی آہوں کی آسودگی اور قلب وروح انسانی کی تسکین کا سامان ہے۔ اختلاف زمان ومکان اور تغیرات ظروف واحوال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب بھی۔ اسی دین میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے انسانیت کا سرفخر سے بلند رہ سکتا ہے۔ اسی میں زمانے کے چیلنجوں کا مسکت جواب ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ آخری دین ہے اور نظام خداداد ہے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ نے آخری پیغمبر بنا

کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ لہٰذا آخری قانون آخری کتاب بھی انہیں کو عطا فرمایا اب قیامت تک یہی دین باقی رہے گا۔ لہٰذا عقلاً بھی ضروری تھا کہ قیامت تک ہونے والے تغیرات وحوادث کا مکمل ضابطہ اس میں موجود رہے۔

واضح رہے کہ احکام اسلام دوطرح کے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ان کو ضروری عقائد کہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں حسب حال تغیر وتبدل اور لچک کی گنجائش باقی رہے گی ان کو فروعی مسائل کہتے ہیں۔ ان کے اندر تبدیلی سے اسلام کا بنیادی ڈھانچہ کبھی نہیں بدلے گا۔

اس کتاب کے مؤلف کے عزیز گرامی قدر مولانا محمد ابراہیم صاحب چترویدی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ بڑے خوش مزاج، ظریف الطبع، طلیق الوجہ اورحسن اخلاق کے پیکر ہیں۔ صرف خطیب ہی نہیں بلکہ کثرت سے کتب بینی کرنے والے باذوق عالم دین ہیں۔ جلسہ گاہوں میں اپنی افرادیت اور شناخت کے ساتھ محسوس کیے جانے والے مقرر ہیں۔ ہندونیپال کے اکثر مقامات کو اپنی جولانگاہ بنا چکے ہیں اور خوب تیز گام ہیں۔

رب قدیر ان کی صحت مجال کو عام وتام کرے۔ ہر مقام پہ شاد کام کرے ہر رنج وغم سے آزاد رکھے۔ آمین

محمد عثمان برکاتی

۳؍شعبان ۱۴۴۵ھ

تقریظ حسن

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ
وصحبہ افضل الصلاۃ والتسلیم، امابعد!

پیکر اخلاص ومحبت فاضل گرامی خطیب سدا بہار حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم رضا صاحب چترویدی جو ہمارے ملک نیپال کے ضلع دھنوشا میں جھٹکو ہیا بستی کے رہنے والے ہیں جو ایک اچھے عالم دین کے ساتھ ساتھ بہترین خطیب بھی ہیں اور کئی سالوں سے اپنی خطابت کے ذریعہ دین متین کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اب ماشاء اللہ تصنیف وتالیف سے بھی اچھا ذوق وشوق اور لگن پیدا ہوگیا۔ چنانچہ زیر نظر کتاب ''اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ موصوف کی مخلصانہ اور گرانقدر کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب کی ضخامت اور اس میں جمع کیے گئے مواد اور حسن ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف نے بڑی عرق ریزی اور محنت جانفشانی کے ساتھ کتاب کو ترتیب دیا ہے۔

دنیا کے سارے مذاہب ایک طرف اور مذہب اسلام ایک طرف جب دونوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ تمام مذاہب میں صرف اور صرف مذہب اسلام ہی حق مذہب ہے کہ کیوں کہ دنیا کے سارے مذاہب خود ساختہ ہیں اور ہر مذہب کا بانی اور پیروکار بزعم خویش

اپنے اپنے مذہب کی حقانیت اور صداقت کا اعلان کر رہے ہیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ تمام مذاہب میں مذہب اسلام ہی حق مذہب ہے کیوں کہ اس مذہب کا خالق پروردگار عالم ہے اور اس رب کائنات نے خود ہی اس مذہب کی صداقت اور حقانیت کا اعلان بھی فرمادیا ہے۔ چنانچہ رب کائنات کا ارشاد پاک ہے: ان الدین عند اللہ الاسلام۔ آل عمران) ترجمہ کنزالایمان: بے شک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے۔

صدر الافاضل حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دین اسلام دین اسلام کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں۔ یہود ونصاریٰ وغیرہ کفار جو اپنے دین کو افضل ومقبول کہتے ہیں اس آیت میں ان کے دعوے کو باطل کرایا۔

پروردگار عالم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولا کریم اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے موصوف کی اس عظیم کاوش کو مقبول خاص وعام فرمائے اور موصوف کے علم وعمل اور عمر میں اور قلمی طاقت میں خوب خوب برکتیں عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ دین متین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

فقیر: محمد داؤد حسین مصباحی
صدر المدرسین الجامعۃ الرضویہ اصلاح المسلمین بھمر پورہ
وجنرل سکریٹری آل نیپال سنی جمیعۃ العلماء

❁❁❁

تقریظ قمر

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امابعد!

زیر نظر کتاب (اسلام اور دیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ) کا کہیں کہیں سے مطالعہ کیا مولانا محمد ابراھیم رضا چترویدی صاحب کا انداز بیان اتنا صاف، سلیس اور سمجھ میں آنے والا ہے کہ پڑھنے والا اگر تھوڑی سی توجہ کر کے مطالعہ کرے تو اسکو کہیں رکاوٹ نظر نہیں آئے گی مولانا نے علاوہ اسلام نو(۹) دیگر ادیان پر قلم اٹھایا ہے حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کے ساتھ اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے امت کی رہنمائی کا حق صرف اور صرف اسلام کو ہے نبی کریم سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات دین کے بارے میں بیان فرمائے ہیں ان کا ایک ایک حرف سچا ہے۔

خصوصا عیسائیت اور یہودیت جو اس وقت دنیا کے اندر اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کیلیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں غیر مسلم دنیا اور ان کی حکومتیں ان کو پروان چڑھانے کے لیے سالانہ بجٹ مقرر کر رہی ہے ان سے متعلق بھی احادیث مبارکہ میں مواد موجود ہے اور قربان جائیں جناب رسول اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے تورات وانجیل اور انکی تحریف کے بارے میں اس مدلل

انداز سے بیان فرما گئے ہیں کہ آج تک عیسائی اور یہودی دنیا ان تحریفات کا جواب نہ دے سکی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب انسانیت کے لیے ایک رہنما ثابت ہوگی خداوند کریم قارئین کرام کو حقیقت پسندی کے ساتھ اس کے مطالعہ کی توفیق عطا فرمائے میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر غیر جانبداری وحقیقت پسندی سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یقینا حق کی راہ کھل کر سامنے نظر آئے گی اللہ تعالی ہم سب کو صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

محمد قمر الزماں ازہری

ڈائریکٹر النساء اکیڈمی دہلی

دعائیہ کلمات

قائد اہلسنت عزیز العلماء حضرت علامہ مولانا اکبر علی صاحب قبلہ بلہی

نحمدہ ونسلم علی حبیبہ الکریم

امابعد!

فاضل گرامی حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم رضا چترویدی صاحب قابل قدر تالیف (اسلام ودیگر مذاہب کا تقابلی جائزہ) کتاب کے چند کلمات دیکھے جو قاضی نیپال حضور مفتی عثمان برکاتی صاحب قبلہ نے تحریر فرمائے یقینا فاضل گرامی نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

رب قدیر کی بارگاہ میں میری دعا ہے کہ اس عظیم کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مزید خدمات کی توفیق بخشے۔آمین یارب العالمین۔

محمد اکبر علی

جامعۃ المدینہ عائشہ للبنات

بلہی نیپال

عرض مصنف

نحمدہ ونسلم علی رسولہ الکریم

امابعد!

دور حاضر کے ترقی پذیر نقل وحمل اور ابلاغ وترسیل نے تمام انسانی آبادیوں کو باہم اس طرح منسلک کر دیا ہے کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک کمبہ یا برادری نظر آنے لگی ہے اور آج دنیا کی ساری تہذیبیں جماعتیں اور مذاہب ہر ایک دوسرے سے محسوس یا غیر محسوس طور پر متعلق ہو گئے ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے دوسروں کا مطالعہ ناگزیر ہے مختلف انسانی جماعتوں تہذیبوں یا پوری نسل انسانی کے مشترک مسئلوں کو عالمی پس منظر میں سمجھنے کے لئے اپنے علاوہ دوسری تہذیبی وتمدونی روایات کا مطالعہ وقت کی ایک اہم ضروت بن گیا ہے اردو زبان میں ایسی کتابوں کی کمی ہے جو اس انداز پر لکھی گئ ہوں جن سے دوسری تہذیبی وتمدنی روایات کے بارے میں واضح معلومات فراہم ہو سکے تہذیبی زندگی کا ایک اہم حصہ مذہبی عقائد ہوتے ہیں ایسی کتابیں جو مندرجہ بالا معیار پر دوسرے مذاہب سے متعارف کرائیں اور بھی کم نظر آتی ہیں میں نے اپنی اس پہلی تصنیف کہ ذریعہ اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے نیز اس بات کا بھی کا خیال رکھا ہے کہ قاری کو اس کتاب کہ مطالعہ کے ذریعہ مختلف مذہبی روایات کو سمجھنے میں ہر طرح کی آسانی میسر ہو اسلیے کتاب میں ان تمام مذاہب کا ایک مختصر اور جامع مطالعہ مع ان کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ یکجا کیا گیا

ہے تاکہ مختصر وقت میں ان مذاہب کو آسانی سے پڑھا و سمجھا جا سکے مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش ان طلباء کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوگی جو دنیا کہ مذاہب پر مطالعہ کرنے کے خواہاں ہوں گے حقیقت یہ ہے کہ میری اس پہلی کاوش کی تکمیل میں محترم پروفیسر ابوالحسن برکاتی صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) کی رہنمائیوں اور مشوروں نے بڑی مدد کی ہے اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطا فرمائے (آمین) میں اپنے دوسرے احباب کا بھی ممنون ہوں بالخصوص شاعر اہلسنت حضرت فاروق رضا برکاتی کیند ریئے نائب صدر علما کونسل کا جن کے مشوروں نے میری ہمت بڑھائی اور میں کام کر سکا آخر میں اپنی اہلیہ محترمہ کا میں بہت ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے گھریلوں مصروفیات سے مجھے فرصت دے کر اس کتاب کی تکمیل کا موقعہ فراہم کیا۔

محمد ابراہیم رضا چترویدی

فاونڈر بہار ڈیولپمنٹ مسلم اکیڈمی

مظفرپور (بہار)

ہندومت

دنیا کے جن علاقوں میں انسانی تہذیب وتمدن نے سب سے پہلے پھلنا پھولنا شروع کیا، ان میں ہندوستان بھی ایک خطہ رہا ہے، چونکہ آریوں میں سے پہلی کی مذہبی روایات کے سلسلہ میں کوئی قابلِ اعتماد معلومات نہیں ملتی ہیں۔ موہن جوداڑو اور ہڑپّا کی کھدائی میں جس تہذیب وتمدن کے آثار ملے ہیں وہ اگر چہ آریوں سے قبل کی ہے، مگر آثار میں ملنے والی زبان سے کوئی خاص معلومات نہیں حاصل ہو پائی ہیں، اسی لیے اس کے بارے میں معلومات بھی محدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آریوں کی آمد کے ساتھ ہی جو مذہبی روایات یہاں یعنی ہندوستان میں متعارف ہوئیں، وہیں سے ہندوستانی مذاہب پر کوئی قابلِ اعتبار گفتگو کی جاسکتی ہے، لہٰذا ہم نے بھی اپنی اس کتاب میں ہندوستانی مذاہب کا ذکر وہیں سے شروع کیا ہے۔

ہندوستان چونکہ ایک قدیم ملک ہے۔ لہٰذا اس کی قدیم مذہبی روایات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، برہمنی مت اور ہندومت۔

برہمنی مت کا مطلب وہ روایات ہیں جن کا آغاز ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بعد یعنی (تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح [۱]) اس مذہبی روایت کو ویدک مت کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، جس میں برہمن کو ایک خاص مرکزی حیثیت

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۹

حاصل تھی، چونکہ برہمنوں کے ذریعہ ہی اس کو فروغ حاصل ہوا تھا اسی لیے اگر اسے برہمنی مت کہا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا۔ برہمنوں نے آریوں کے مذہبی شعور کی پوری نمائندگی کرتے ہوئے قدیم مذہبی اصولوں کی رہنمائی میں اس مذہبی روایت پر اپنا اثر بنائے رکھا، اگر چہ برہمنی روایات میں تبدیلیاں ہوتی رہیں مگر اس روایت نے اپنا ویدک رنگ اُڑنے نہیں دیا۔

برہمنی مت کے زمانے میں جو مذہبی ادب وجود میں آیا، وہ سارا ویدک ادب میں شامل ہے۔ برہمنی مت اور ہندومت میں وید کو ایک خاص مذہبی مقام حاصل ہے اور اسے ''شُرتی''، یعنی الہامی ادب کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں شامل مذہبی حقائق کو کسی کی تخلیق نہیں سمجھا جاتا ہے۔[1]

اگر چہ پورا ویدک ادب مقدس اور ''شرتی''، میں شامل سمجھا جاتا ہے، پھر بھی ویدوں کو مختلف بنیادوں پر مختلف قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک تقسیم ویدک ادب کی اس کے حصوں کے زمانۂ تصنیف اور ان کے موضوع کی بنیاد کی گئی ہے، جو قدیم آریائی دیوی دیوتاؤں کی شان میں کہے گئے بھجن اور گیتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد والے ویدک ادب کو ''برہمن'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ تصانیف زیادہ تر مذہبی رسومات، آداب زندگی اور قربانی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ برہمن تصانیف کے آخری دور میں ویدک ادب کی ایک تیسری قسم کی ابتدا ملتی ہے جو اپنے موضوع اور مذہبی فکر کے لحاظ سے پہلی دونوں قسموں سے مختلف ہے، جسے آرنیکا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کیونکہ یہ ویدک ادب کا آخری حصہ ہے، یعنی اس پر ویدک کا انت ہوتا ہے اسی لیے اس کو ویدانت کہتے ہیں۔

---

۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۰

اُپنشد کے بعد کی تصانیف کو جو برہمنی مت کی مقدس کتابیں کہی جاتی ہیں جیسے رامائن، مہابھارت وغیرہ ان کو ویدک ادب کا حصہ نہیں مانا جاتا، کیونکہ انہیں الہامی کلام ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ یہ انسانوں کی تصانیف شمار کی جاتی ہیں۔ ویدک ادب کی یہ دوسری تقسیم جو زیادہ معروف ہے، اس کے مطابق پورے ویدک ادب کو چار ویدوں میں بانٹا گیا ہے۔

(۱) رِگ وید (۲) سام وید (۳) یجُر وید (۴) اَتھر وید

رگ وید کا وہ حصہ جو سب سے قدیم ہے اس میں ۱۰۱۷ بھجن شامل ہیں، جن کا تعلق مختلف دیوی دیوتاؤں سے ہے۔ یہ برہمنی مت کے لیے ایک اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

سام وید: اس میں زیادہ تر رِگ وید کے ہی بھجن شامل ہیں، جنھیں مخصوص یگیّہ (قربانیوں) کے مواقع پر پڑھنے کے لیے الگ کرلیا گیا ہے۔

یجر وید: میں بھی کچھ اضافوں کے ساتھ رگ وید سے منتخب کردہ بھجن شامل ہیں۔ انھیں بھی قربانی یا یگیہ کے موقع پر پروہت پڑھتا ہے۔ اتھر وید اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سب سے بعد کے زمانے کا جمع کردہ ہے۔ بہت زمانے تک اسے وید میں شامل نہیں مانا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک کے منتر شامل ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں عوامی رجحانات کی نمائندگی ہوتی ہے، جب کہ پہلے تینوں وید سماج کے اعلیٰ طبقوں کے مذہبی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔

الغرض! اُپنشد کے ساتھ ہی ویدک ادب، جس کو برہمنی مت اور ہندو مذہب میں الہامی ہونے کا درجہ حاصل ہے، کا دور ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد جو ادب

تصنیف ہوا وہ ''سمرتی'' کہلاتا ہے، اس لیے کہ اس کو انسانوں کا تصنیف کردہ سمجھا جاتا ہے، اسی لیے تقدیس میں اسے دوہ درجہ حاصل نہیں ویدک ادب کو حاصل ہے۔

اس طرح برہمنی مت کے سلسلہ میں اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس مذہبی روایت میں ایک تدریجی ارتقاء ہے، جو ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس ایک ہزار سالہ فکری سفر میں مخصوص صفات کا حامل ایک مذہبی ادب وجود میں آیا، جو بعد میں ہندو روایتوں کے گونا گوں مظاہر کی بنیاد بنا۔

رامائن اور مہابھارت کا زمانہ

۵۰۰ قبل مسیح کے قریب ویدک دور کے ختم ہونے سے لے کر (۴۰۰ عیسوی) تک کے دور کو رزمیہ نظموں یا رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور اپنی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کے لحاظ سے ویدک دور سے کافی مختلف اور ممتاز نظر آتا ہے۔ اس رزمیہ نظموں کے دور میں ویدک عہد سے مختلف آریائی سماج اور بدلی ہوئی برہمنی روایات کا وجود ملتا ہے۔ اس دور کے سماج اور مذہبی رجحانات کا صحیح اور واضح اندازہ ان کی دور رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت سے بخوبی ہوسکتا ہے، یعنی اس دور کے معاشرتی اور مذہبی مطالعہ کے لیے یہ دونوں نظمیں اہم ترین ماخذ ہیں۔

مہابھارت

یہ دونوں رزمیہ نظمیں دراصل زیادہ طویل اور مختلف قسم کے کردار رکھنے والی

تصانیف ہیں۔ ویدوں سے مختلف، سنسکرت میں لکھی ہوئی یہ طویل نظم اپنے دور کے ہندوستان کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم کا مرکزی قصہ راجا بھرت کے اخلاق کوؤں اور پانڈوؤں کے درمیان تخت نشینی کی جنگ سے متعلق ہے، نیز اس کتاب میں بہت سی غیر متعلق روایات اور دوسرے قصے اور واقعات بھی موجود ہیں۔ یہ نظم قدیم ہندوستان سے متعلق معلومات کا خرانہ کہی جاسکتی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نظم کے مرکزی واقعات میں برابر اضافے ہوتے رہے، قدیم ہندوستان کے اور بھی بہت سے رائج قصوں اور روایات کو اس میں جگہ دی جاتی رہی، اس طرح اس میں تقریباً ایک لاکھ اشعار جمع ہوگئے۔

رامائن کے مقابلہ میں مہابھارت زیادہ قدیم ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔

رامائن

رامائن ایک شخصیت یعنی رام چندر جی اور ان سے متعلق لوگوں کے بارے میں ایک مربوط قصہ ہے۔ مہابھارت کے مقابلہ میں یہ زیادہ ترقی یافتہ، مہذب اور بااخلاق معاشرہ کی عکاسی کرتی ہے، اسی لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رامائن کے مرکزی واقعات مہابھارت کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن عام طور پر رامائن کو مہابھارت کے مقابالہ میں زیادہ قدیم تصور کیا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مہابھارت اور رامائن، دونوں ہی شاہکار آریہ اور غیر آریہ ہندوستانی عناصر کی آمیزش سے ابھرتے ہوئے اور برہمنی مت کے زیر سایہ پروان چڑھتے ہوئے، ہندو مذہب کے ابتدائی دور کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ یعنی ہندو مذہب کے ارتقاء کے ایک ہی دور کی داستان سناتے ہیں۔ مہابھارت اور رامائن اس وقت وہ سب سے قدیم اور اہم ماخذ ہیں جن میں ہندومت کے اہم فرقوں

مثلاً: وشنو مت، شیو مت اور شکتی مت کے علاوہ دیگر بہت سی مشہور دیوی دیوتاؤں کا واضح اور بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔ مہا بھارت کا ہی ایک حصہ اس مشہور ومعروف فلسفیانہ وعظ پر مشتمل ہے جو بھگت گیتا کے نام سے مشہور ہے۔

بھگوت گیتا

جس کو شری کرشن جی کے بیان کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے، اپنے وقت کے ترقی پذیر فلسفیانہ اور مذہبی افکار کا نچوڑ کہی جا سکتی ہے۔ یوں تو گیتا کو الہامی درجہ تو حاصل نہیں ہے، مگر عملی اعتبار سے اس کو ویدوں سے کم اہمیت والا درجہ نہیں دیا جاتا۔ ہندو مت میں موجود اہم مذہبی تصورات کی جانکاری کے لیے یہ ایک بہترین دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم ان مذہبی اور فکری تصورات پر نظر ڈالیں جو مہا بھارت اور رامائن کے زمانے میں ترقی پذیر تھےی، تو وہ ہم کوئی ابھرتی ہوئی ایک مذہبی روایت (ہندو مت) کی نشان دہی کرتے نظر آتے ہیں۔

نئے دیوی دیوتاؤں کا ظہور

ویدک دور کے برعکس، جس میں کائنات کی فطری قوتوں سے متعلق مختلف دیوی دیوتا اہمیت رکھتے ہیں، مہا بھارت اور رامائن میں کچھ نئے دیوی دیوتا مذہبی زندگی پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے برہما، شیو، وشنو اور ایک دیوی ماں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ برہما، شیو اور شنو کو 'تری مورتی' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

برہما اور وشنو اگرچہ ویدک ادب میں بھی مذکور ہیں، مگر مہا بھارت اور رامائن میں ان کی حیثیت میں نمایاں تبدیلی ملتی ہے۔ برہما، جسے ویدک ادب کے آخری دور میں سب سے عظیم دیوتا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، رامائن اور مہا بھارت

میں صرف کائنات کی تخلیق کے ذمہ دار دیوتا کی حیثیت رکھتا ہے۔ وشنو اور شیو کے مقابلہ میں برہما اپنا ویژن بدستور کھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ عوام کی عقیدت کے اصل مرکز اور مذہبی عظمت کے اصل حقدار وشنو اور شیو چمکتے رہ جاتے ہیں۔

'تری مورتی' کے تصور میں اگر برہما کائنات کی تخلیق کا ذمہ دار ہے تو کائنات کی بقاء اور پرورش کی ذمہ داری وشنو کے سر ہے، جس کی شخصیت کے تصور میں جمال کا پہلو غالب معلوم ہوتا ہے۔

شیو اپنی صفات کے لحاظ سے وشنو سے مختلف دیوتا ہے۔ وشنو کو اگر جمال کا مظہر سمجھا جائے تو شیو اُلوہی طاقت کے قہر وجلال کی تجسیم ہے۔ اس کی شخصیت میں صفتِ بے نیازی، ماورائیت، انفرادیت اور پُراسراریت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وشنو اگر اپنی ہمدردانہ صفات سے دلوں کی تسلی کا باعث بنتا ہے تو شیو اپنی بے نیازی اور جلال سے دلوں کو دہلا کر لوگوں کے سروں کو اپنے آگے خم کرا لیتا ہے۔ وشنو اور شیو کی طرح، کسی نہ کسی صورت میں دیوی ماں کی پرستش بھی ہندو مت کا مقبول ترین تصور ہے۔ دیوی ماں کے کئی مظاہر میں پاروتی یعنی شیو کی بیوی کی حیثیت کالی کی حیثیت، نیز تانترک فرقہ کی دیوی بھیرویں کی حیثیتیں کافی اہم ہیں، اور کہیں بھوانی کی صورت میں جرائم پیشہ لوگوں کی معبود سمجھی جاتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رزمیہ نظموں کے دور کے ابھرتے ہوئے دیوتاؤں میں وشنو، شیو اور دیوی ماں نے نئے ہندو مت کے عظیم ترین دیوتاؤں کی حیثیت حاصل کر لی، یہی نہیں ان میں سے ہر ایک کے نام پر ہندو مت میں بہت سے فرقے وجود میں آ گئے اور برہما دھیرے دھیرے پس منظر میں چلا گیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندو مت کی تاریخ درحقیقت انہیں دیوتاؤں سے وابستہ فرقوں کے

نشوونما کی داستان ہے، اسی لیے رزمیہ نظموں کے بعد کے ابھرنے والے مذہب کو نیا ہندومت یا فرقہ بندیوں کا ہندومت کہا جاسکتا ہے۔

ویدک رسومات میں قربانی یا یگیہ کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی ، وہ نئے ہندومت میں ختم ہوگئی ، بلکہ وشنومت میں تو اس کی مخالفت کی گئی اور اس کی جگہ پوجا کو ایک مرکزی مذہبی رسم کا درجہ حاصل ہوگیا۔

اس نئے ابھرتے ہوئے ہندومت کی ایک بڑی خصوصیت، جو اس کی مقبولیت اور نشو ونما کا بڑا سبب بنی، وہ اس کی مختلف روایتوں کو اپنے افکار ورسومات میں سمو لینے کی صلاحیت تھی ۔ اس کے برخلاف قدیم برہمنی مت پر مکمل طور پر برہمنوں کی اجارہ داری تھی، اس میں آنے والی ہر تبدیلی کے لیے برہمن ہی ذمہ دار تھے، اس مت کا دائرۂ عمل صرف سماج کے اعلیٰ طبقہ تک محدود تھا، سماج کے درمیانی اور نچلے طبقے نہ تو اس سے براہ راست استفادہ کرسکتے تھے اور نہ ہی برہمنی مت کو ان کی مذہبی ضرورتوں سے کوئی دلچسپی تھی، یعنی یہ صرف برہمن طبقہ کا ہی مذہب بن کر رہ گیا تھا۔

ہندومت اس کے برخلاف ایک عوامی مذہب تھا۔ اس کے عقائد ورسومات سب کے سب اس طرح تھے جو عوام کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عرصہ تک ہندوستان میں بدھ مت اور جین مت کے غلبہ کے بعد، ہندومت کا ارتقا برہمنی مت کو ایک عوامی رنگ دینے کی کوشش کہا جائے گا، اس لیے کہ ان حالات میں برہمنی مت نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب ہندوستان میں اس کی بقا اور نشوونما ایک عوامی رنگ اختیار کرانے پر ہی منحصر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رامائن اور مہا بھارت میں ابھرتے ہوئے عوامی عقائد ورسومات کی ہمت

افزائی خود برہمن عالموں نے کی ، نیز ان کی ترقی اور نشوونما میں بھرپور حصہ لیا، اس لیے ہندومت برہمنی مت سے مختلف ہونے کے باوجود برہمنی مت کا وارث یا اُس کا جانشین تسلیم کیا گیا۔ خود ہندو روایت کے عقیدے کے مطابق وہ ویدک اور برہمنی روایت کے تسلسل کا ہی نام ہے، اسی لیے ہر ہندو عقیدے اور رسم کی سند، ویدک ادب سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ویدوں کا تعلق ہندومت سے حقیقی کے بجائے رسمی زیادہ ہے، کیونکہ ہندو روایت کا ارتقا ہی ویدوں کے تسلط سے آزاد رہ کر ہوا ہے۔ [۱]

ہندومت کے اس مختصر تعارف کے بعد اب ذیل میں ہندومت کے ان اہم فرقوں کو دیکھیں گے جن پر عہد وسطیٰ کے پورے دور یعنی ۵۰۰ عیسوی سے دور جدید تک ہندومت کی بنیاد رہی ہے۔

ہندومَت میں فرقہ بندی کا آغاز

ہندومت کے جو مذہبی رجحانات مہا بھارت اور رامائن میں ملتے ہیں، موجودہ دور کے ہندو مذہب کی بنیاد نہیں مذہبی رجحانات اور رسومات پر مبنی ہے۔ یہ عقائد ورسومات پُرانوں کے عہد میں بامِ عروج پر تھے۔

پُران ہندو روایات کی سب سے مقدس اور آخری تصانیف ہیں جو ہندو دیو مالائی عناصر کے ذریعہ مذہبیات کو پائے استقامت بخشتی ہیں۔ دورِ قدیم میں پُرانوں کے لیے عناصر خمسہ کو ضروری قرار دیا گیا تھا، کیونکہ ان کی حیثیت بنیاد کی سمجھی گئی تھی، لیکن بعد کے پُرانوں میں ان اصولوں کی پابندی بہت کم نظر آتی ہے۔

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ نمبر ۴۳

ہندومت عہد وسطیٰ تک پوری طرح فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ تقسیم اچانک نہیں تھی، بلکہ رزمیہ نظمیوں کے عہدے سے ہی اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ برہما، وشنو اور مہیش جنہیں 'تری مورتی' کہا جاتا ہے، کے ساتھ ساتھ ایک دیوی ماں بھی منظر عام پر آکر غیر معمولی مقبولیت کی حامل بنیں، جب کہ برہما عوام کے ذہنوں کو مسخر کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، اتنا ضرور ہے کہ برہما کی حیثیت ہندو دینیات میں ایک مستند و معروف دیوتا کی ہے۔ سوائے برہما کے مدرجہ بالا سبھی دیوتاؤں کے نام پر ہندومت میں فرقے وجود میں آئے۔ ہندو مت کے عظیم دیوتاؤں کا وجود میں آنا، اور پھر عوام میں قبولیت کی سند حاصل کرنا، ان سب کاموں میں ایک لمبا عرصہ لگا۔ عہد وسطیٰ ک تاریخ در حقیقت انہیں فرقوں کے آغاز و عروج کی داستان کے بجز اور کچھ نہیں۔

قدیم برہمنی اور ویدک دھرم میں جو فرق تھا، اس کے بارے میں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ویدک رسومات یعنی یگیہ یا قربانی کو قدیم برہمنی مت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، جب کہ نئے ہندومت میں یگیہ کو بالکل ہی ختم کر دیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ وشنو مت قربانی سے اس قدر متنفر ہوا کہ قربانی کی مخالفت کرنا ان کے یہاں ایک فریضہ سمجھا جانے لگا۔

ویدک دھرم میں قربانی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ فریضہ صرف برہمنوں کے ذریعہ ہی صحیح طور پر ادا ہو سکتا تھا۔ مذہبی رسومات صرف قربانی کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتی تھیں۔ دیوتا قربانی کے بس میں تھے۔ دیوتا کا قرب حاصل کر کے کوئی بھی منصب و مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا، قربانی کے مقابلے کسی اور طریقۂ عبادت کی کوئی حقیقت نہ تھی، جب کہ پوجا کے ذریعہ صرف دیوتا کی

عقیدت و محبت ہی حاصل کی جا سکتی تھی۔ ویدک عہد میں برہمنوں کی حیثیت کلیدی تھی۔ برہمن علماء ہی دھرم کے اصول و ضوابط کی ترتیب و ترمیم یا تنسیخ کے ذمہ دار تھے۔ یعنی کوئی بھی عمل جس کا تعلق براہ راست مذہب سے ہو یا زندگی کے کسی شعبے سے ان کے عمل دخل کے بغیر پائے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جین اور بودھ دھرم نے جب ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اپنا مرکز و محور ان طبقوں کو بنایا جنہیں برہمنی مت ذلیل و کمتر سمجھتا تھا۔ لہٰذا مہاتما بدھ نے جب مساوات کا نعرہ بلند کیا تو لوگ جوق در جوق ان کی پناہ میں آنے لگے اور مختصر سے عرصے میں بدھ مذہب ہندوستان کا ہر دلعزیز مذہب بن گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب کے مبلغین نے اپنے خیال کے اظہار کا ذریعہ مقامی بولیوں کو بنا لیا تھا، جب کہ برہمنی مت کی زبان خالص آریائی یعنی سنسکرت تھی، جو کہ اعلیٰ طبقے تک محدود تھی۔ ویدک دھرم اب حاشیے پر چلا گیا تھا یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ برہمنی مت ایک بےی نور چراغ بنتا جا رہا تھا۔ بدھ اور جین مت سے محصور برہمنی مت آخر کار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہندوستان میں مقبولیت اب اسی حالت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اس کی بقا و نشو و نما ایک عوامی شکل اختیار کر لے۔

نئے ہندومت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے اندر تمام رسومات و روایات کو سمو لینے کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی، اور یہی اس کی مقبولیت کی ضامن بنی۔ ہندومت میں شمولیت کے لیے کسی طرح کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی تھی کوئی شخص بھی خواہ، وہ کسی قبیلے، کسی ذات، کسی مذہب اور کسی نسل سے متعلق ہو، اپنے مذہبی عقائد و رسومات کے ساتھ اس نئے مذہب میں داخل ہو سکتا تھا۔ برہمنی

مت کا تعلق براہ راست اعلیٰ طبقے سے تھا، جب کہ ہندومت میں تمام طبقات کے لوگ شامل ہونے لگے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو پہلے نہ تو اس مذہب سے مستفید ہوسکتے تھے اور نہ ہی برہمنی مذہب کو ان کی ضرورتوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ سماج کی وہ ذاتیں جو برہمنی مت میں حقیر سمجھی جاتی تھیں، وہ تمام اس مسلک کے سارے مذہبی معاملات سے ہمیشہ دور رکھے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندومت کا ارتقاء برہمنی مت کے عوامی رنگ اختیار کرنے کی ہی کوشش کا نتیجہ تھی۔

مہابھارت اور رامائن عہد کے تمام مذہبی عقائد اور سماجی روایات کی برہمن عالموں نے نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے ذریعہ برہمنی مت کی تائید اور سند قبولیت بھی بخشی۔

ہندومت ئے تمام نسلی، قبائلی و مقامی عقائد و رسومات کو جگہ دے کر اپنے دائرے کو اس طرح پھیلایا کہ ہندومت میں متضاد خیالات و افکار رکھنے والے سبھی لوگ اپنے اپنے دیوتاؤں کے ساتھ اس میں شامل ہوتے گئے، یہی وجہ ہے کہ اس مذہب میں اپنے اپنے دیوتاؤں سے عقیدت رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے دیوتاؤں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی ضرورتوں کے واسطے ہر فرقہ اپنے دیوتا کی طرف رجوع کرتا اور اسی کو خالق کائنات سمجھتا ہے۔ اس طرح اس مذہب کی ایک اہم خصوصیت سب دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم کا جذبہ تھا۔ ہر ہندو وقتاً دوقتاً سبھی دیوی دیوتاؤں سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ ہر فرقہ اپنے معبود کو معبود حقیقی اور بقیہ دیوتاؤں کو اس کا روپ سمجھتا تھا۔ شیو کے بھکت وشنو اور دیوی ماں کو اس کا اوتار یا شیو کی ہی مختلف صفات کا ظہور سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وشنو کے بھکت شیو اور دیوی ماں کو وشنو کی مختلف صفات کا ظہور یا اوتار سمجھتے ہیں۔

ہندومت میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ مختلف دیوتا جو مخصوص نسلی اور تہذیبی روایتوں کی دین ہیں، ان کے اتحاد سے ہی کسی ایک دیوتا کی تخلیق ممکن تھی، اور بعض اوقات کسی ایک دیوتا کی مختلف صفات یا اس کے مختلف مظاہر میں ان دیوتاؤں کا نشان مل سکتا تھا، جن کے باہم اتحاد سے اس دیوتا کی شخصیت کی تکمیل ممکن تھی۔

برہمنی مت میں جہاں خالص آرین ثقافت کی نمائندگی ہوتی تھی وہیں جب ہندومت نے غیر آریائی قبائل کو جگہ دینا شروع کی تو اس میں برہمن اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی قبائل کے مذہبی عقائد، رسومات بھی جگہ پانے لگے۔ پھر بھی ان سب میں برہمنی مت اور ان کے عقائد کو اولیت حاصل رہی۔------- ------------۔ ہندومت میں 'تر مورتی' کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ ترِ یعنی ان تینوں کے نام پر تین فرقے وجود میں آگئے۔

ہندومت میں شیو کو بہت اہمیت حاصل ہے جس کی طاقت اور اوصاف کا ذکر اکثر و بیشتر لوگوں کی زبانی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ مہابھارت اور پُرانوں میں بھی اس کے بارے میں بہت سارے قصے کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ دوسرے دیوتاؤں سے اگر ہم شیو کا موازنہ دوسرے دیوتاؤں سے کریں تو یہ بے شمار مافوق الفطرت اور متضاد قوتوں کا حامل نظر آتا ہے۔ جہاں ایک طرف اس کو کائنات کی فنا و بقا کا ضامن کہا جاتا ہے، اور اس کی شبیہ نہایت پُر ہیبت، گلے میں سانپ، جسم پر شیر کی کھال، انسانی کھوپڑیوں کی مالا کے ساتھ پُر غضب نظر آنے والی ہے، وہیں دوسری طرف وہ مقدس پاکیزہ اور خوبصورتی کی شبیہہ والی ایک ذات بھی تصور کی جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی طرح خاندان رکھتا ہے،

غیب کے رازوں سے واقف اور حاضر وناظر ہے۔تصویروں میں وہ ایک مراقب اور تپسّوی نظر آتا ہے۔شیو کی یہ شبیہہ مقبول عام ہے۔رقص وموسیقی کا دلدادہ،نرم دل اور اپنے بھکتوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔شیو کے پرستار'شیومت' کے علمبردار کے طور پر مشہور ومعروف ہیں۔

ویدک عہد کے آخر میں وشنو نارائن، کرشن اور واسودیو کی شخصیتوں کے باہم اتصال سے عوام کا ہردلعزیز دیوتا بن گیا۔اس طرح انہیں ایک ایسا عوامی دیوتا مل گیا،جس سے ہندومت میں غیر آریائی عناصر کی شمولیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

مہابھارت کے قصے میں جہاں کرشن کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے، وہیں کرشن واسودیو کے معتقدین میں وحدانیت اور عشق حقیقی (بھکتی) اور سچی عقیدت پر زور دیا گیا ہے۔'بھگوت گیتا' ایک غیر معمولی اور لافانی تصنیف ہے، جس نے وشنو تحریک کو مزید تقویت بخشی۔

اس مت کی دوسری اہم تصنیف بھگوت پُران، آٹھویں صدی عیسوی میں تصنیف کی گئی جس سے کرشن کی زندگی پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔کرشن واسودیو کی والہانہ عقیدت میں جہاں تصوف کی بنیاد پڑی وہیں شمال وجنوب میں بے شمار فلسفیانہ تصانیف عالمِ وجود میں آئیں۔نیز شمالی ہندوستان کے عوام نے والہانہ بھکتی کے اس رجحان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جس نے وشنومت کے عقیدت مندوں کے ذریعہ فروغ پایا تھا، اور پھر وشنومت کی یہ شکل ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی یہاں تک کہ وشنومت کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ ہندو مت کا غالب ترین فرقہ بن گیا۔

شیومَت

شیو کے بارے میں خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے قدیم ترین دیوتاؤں میں سے ہیں۔وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق جو آثار قدیمہ ملے ہیں، ان میں ایسی مہریں ملی ہیں جن پر شیو کی خصوصیات رکھنے والے ایک دیوتا کی شبیہ نقش ہے۔اس بنا پر یہ سمجھا گیا ہے کہ شیو یا اس سے ملتے جلتے ایک دیوتا کی پرستش آج سے ساڑھے پانچ ہزار سال قبل بھی ہندوستان میں ہوتی تھی۔ابتدائی ویدک ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آریہ بھی اپنے ساتھ ہندوستان میں ایک ایسے دیوتا کا تصور لے کر آئے تھے،جس کی خصوصیات بہت حد تک قدیم ہندوستانی دیوتا شیو سے ملتی جلتی تھیں،جو 'رُدر' کے نام سے مشہور تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آریوں اور ہندوستان کے قدیم باشندوں کے باہمی اختلاط کے نتیجہ میں محسوس کیا گیا کہ رُدر اور ہندوستان کا شیو ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، یہی وجہ تھی کہ ویدک دور کے آخر میں رُدر شیو نام کا ایک دیوتا منظر عام پر ملتا ہے، جس میں شیو اور رُدر کی شخصیتیں جذب ہوگئی ہیں، اور جو دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ویدک عہد سے گزر کر جب رزمیہ نظموں کا دور آیا تو مہابھارت میں پہلی بار شیو اپنی الگ خصوصیات کے ساتھ ایک مکمل شخصی دیوتا کی صورت میں نظر آتا ہے۔یہاں شیو کو اگرچہ ایک عظیم دیوتا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، اور اس کی مخصوص صفات سے متعلق مختلف دیومالائی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں، تاہم شیو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا پتہ اس فرقے کے ذکر سے بھی چلتا ہے جو شیو کو پشوپتی کی شکل میں ماننے والے بھگتوں کا تھا۔شیو کی شخصیت کو مزید مقبولیت اور ترقی

اُس وقت ملی جب رزمیہ نظموں کے دور کے بعد پُرانوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندومت کے دوسرے فرقوں کی طرح شیو کے پرستاروں نے بھی ایسے پُران تصنیف کئے جن کا محور ان کا اپنا دیوتا شیو تھا، اور جن میں شیو مت کے مخصوص نظریات کی تبلیغ شامل تھی۔ [۱]

شیو کی جو تصویر مہا بھارت اور پُرانوں میں بیان کئے گئے قصوں اور تذکروں سے سامنے آتی ہے، وہ متضاد صفات کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف وہ 'تری مورتی' میں کائنات کو فنا کرنے والا اس کی بربادی کا ذمہ دار دیوتا تصور کیا جاتا ہے، دوسری طرف متعدد تذکروں میں اس کی پاکیزگی، تقدس اور ذاتی حسن و جمال کی قسم بھی کھائی گئی ہے۔ اسے اپنے بھکتوں کی مرادیں پوری کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف اس کو جلال وغضب سے بھرا ہوا دیوتا مانا جاتا ہے، تو دوسری طرف اسے ایک نرم مزاج دیوتا بھی سمجھا گیا ہے، جسے خوش کرنے کے لیے تلسی کے چند پتوں کا نذرانہ ہی کافی ہے۔

شیو کی شخصیت کے تصور میں تنوع اور اس کی مختلف قسم کی شخصیات کا اس سے اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندومت میں شیو کی آٹھ صورتیں مستند مانی جاتی ہیں، ان آٹھ صورتوں کے مطابق وہ مختلف اوقات یا مختلف حلقوں میں پوجا جاتا ہے۔

ویشنومت

ابتدائی ویدک ادب میں وشنو ایک کم اہمیت والے دیوتا کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اپنی اصلیت کے لحاظ سے یہ ایک آرین دیوتا ہے۔ ویدک دور

(۲) پرتیمابوس 'دی ہندو ریلجس ٹریڈیشن' الائڈ پبلیشرز، نئی دہلی ۱۹۷۸ء صفحہ نمبر ۴۴۔ ۲۴۳

کے آخر میں وشنو کی اہمیت بتدریج بڑھنے لگی تھی، یہاں تک کہ ویدک دور کے آخر تک وہ خدائے مطلق کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ [۲]

وشنو کی مقبولیت کی تاریخ میں دوسرا اہم موڑ اس وقت آیا کہ جب وشنو کو کرشن واسودیو کی شخصیت سے ملا دیا گیا، اور پھر تیسری صدی قبل مسیح تک وشنو نارائن جو ۵۰۰ قبل مسیح سے پہلے کا ایک دیوتا ہے۔ اور کرشن واسودیو کو ایک دیوتا تسلیم کرلیا گیا۔ کرشن واسودیو ایک غیر آریائی قوم یادو کا قبائلی دیوتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یادوؤں کے علاوہ دوسرے ہندوستانی عوام بھی کرشن واسودیو کے حلقۂ اثر میں آتے جارہے تھے۔ وشنو نارائن اور کرشن واسودیو کا انضمام دونوں فریقوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ برہمنی مت جو بدھ مت اور جین مت کی عوامی مقبولیت سے پریشان ہوکر عوام میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا، اسے کرشن واسودیو میں ایک ایسا عوامی دیوتا مل گیا جسے وشنو کے اوتار کی صورت میں اپنا کر غیر آریہ عناصر کو بھی برہمنی حلقۂ اثر میں آسانی سے شامل کرلیا گیا۔ اس طرح وشنومت کو کرشن پرستی کا مذہب بن کر خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مہابھارت کے مختلف حصوں کا مطالعہ اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مہا بھارت، جو ابتداء میں ایک غیر جانبدار تصنیف تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وشنو عقائد اور نظریات سے بھر دی گئی، اور اپنی موجودہ صورت میں وہ بلاشبہ وشنومت کی طرفدار تصنیف بن گئی ہے۔ چنانچہ مہابھارت کا وہ اہم ترین حصہ جس میں وشنو عقائد اور سری کرشن کے کردار کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے، وہ بھگوت گیتا کے نام سے

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ نمبر ۷۴

موسوم ہے، مگر بعض محققین کا خیال ہے کہ مہا بھارت میں اضافہ بعد کے کچھ ویشنو
ئی علماء کی دین ہے جنہوں نے وشنومت کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے۔
بھگوت گیتا میں سری کرشن کو وشنو کے اوتار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

بھگوت گیتا میں برہمنی قربانیوں پر مبنی رسومات کے بجائے کرشن کی عبادت
کے لیے عشق حقیقی (بھکتی) پر زور دیا گیا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ وشنومت نے ہند
وستانی مذاہب میں اپنا ممتاز مقام بنالیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ
ہی عوامی حلقوں میں وشنومت کے اثرات بڑھنے لگے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں
جنوبی ہندوستان، خاص طور پر مدراس کے سنت شاعروں نے جو آلور سنتوں کے
نام سے مشہور تھے، اپنی صوفیانہ شاعری میں وشنو اور اس کے اوتار کرشن کو معبود حقیقی
مان کر ان کے لیے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ یہ شاعری اور ان سنتوں کے
جذبات عوام کے لیے بہت پُرکشش اور پُرتاثیر ثابت ہوئے۔ وشنومت کی ایک
دوسری اہم ترین تصنیف بھگوت پُران اسی آٹھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند
وستان میں تصنیف ہوئی۔ اس کا اہم حصہ وہ ہے جہاں سری کرشن سے گوپیوں کی
والہانہ محبت کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف پورے طور پر کرشن بھکتی کے رنگ
میں ڈوبی ہوئی ہے، اور عشق حقیقی کے اس رجحان کو تقویت دیتی ہے جس کی ابتداء
آلور سنتوں نے کی تھی۔ دسویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی کے دوران
جنوبی ہند میں وشنومت کے ایسے مفکر پیدا ہوئے جن کے ذریعہ بھکتی کے فلسفیانہ
خیالات کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، جن میں رامانج اچاریہ اور مادھواچاریہ سب
سے زیادہ مشہور ہیں۔ جس زمانہ میں جنوبی ہندوستان میں بھکتی کا فلسفیانہ پہلو موضو
ع بحث تھا، اسی وقت بھکتی کے رجحان نے شمالی ہندوستان کا رُخ کیا، جہاں مسلم صو

فیاء ہندوستانی عوام کے سامنے عشق حقیقی کا اسلامی نمونہ پیش کر رہے تھے۔ شمالی
ہندوستان کے عوام نے بھی بھکتی کے والہانہ رجحان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور بہت جلد
اس کے سنتوں کے ہاتھوں وشنومت کی یہ شکل شمالی ہندوستان کے کونے کونے میں
پھیل گئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں رامانند اور ان کے شاگردوں سے متعلق سنتو
ں نے جیسے روی داس، کبیر، دھرم داس، تلسی داس، میرابائی، نام دیو اور سری چیتنیہ
وغیرہ کے ذریعہ بھکتی کو اور وشنومت کو وہ مقبولیت عطا ہوئی کہ جس نے وشنومت کو
ہندومت کا غالب ترین فرقہ بنا دیا۔

دیوی مَت

شیو کی پرستش کی طرح ہندوستان کے قدیم ترین مذہبی عقائد میں ایک دیوی کا
تصور بھی رہا ہے۔ کیونکہ ہندوستانی تہذیب کے آثار کی کھدائی میں شیو جیسے ایک دیوتا
کی تصویروں کے علاوہ ایک دیوی کی مورتیاں بھی ملی ہیں، جو شاید خوشحالی اور زرخیزی کی
دیوی کی حیثیت سے پوجی جاتی تھی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دیوی، ایک دیوی ماں
کی صورت میں جو حقیقت الٰہیہ کے تصور کا مظہر تھی۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ
ہندوستان میں ایک دیوی ماں کی حیثیت کی مختلف طاقتوں کو دیویوں کی حیثیت سے مانا
جاتا تھا۔ ویدک ادب میں اسی لیے بہت سی قوتوں سے متعلق مختلف ناموں کے ساتھ
دیوی کا ذکر ملتا ہے۔ مہابھارت میں دیوی کا تذکرہ دُرگا کی حیثیت میں ملتا ہے، جو سری
کرشن کی بہن ہے۔ کہیں شیو جی کی پوس اُما کی صورت میں ہے تو کہیں اسے کالی کی
صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ویدک اور رزمیہ نظموں کے دور کے بعد جب پُرانوں
میں داخل ہوتے ہیں تو ہندومت کی مذہبی کتابوں دیوی ماں اور اس کی شخصیت کی

تفصیلات زیادہ بڑے پیمانے پر ملتی ہیں، مثلاً کہیں دیوی کو تری مورتی کے تینوں دیوتاؤں کی شکتی کے طور پر پیش کیا گیا ہے تو کہیں کالی کی صورت میں دیوی کو شیو کی پوشیدہ قوت کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دیوی ماں حقیقت اعلیٰ کے مظہر کی حیثیت سے کالی اور دُرگا کی حیثیتوں میں زیادہ پوجی جاتی ہے۔

ہندومت میں مذہب کا مقصود ابتدائی زمانہ میں فرد کی اپنی بھلائی، اور بعد کے دور میں فرد کی اپنی نجات (موکش) رہا ہے، شاید اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ہندومت ایک انفرادیت پسند مذہبی روایت ہے، جس میں سماجی زندگی کی اصلاح اور بہتری کو مذہب کے اہم مقاصد میں شامل نہیں سمجھا گیا ہے۔[۱]

ہندو مفکرین اور مذہبی علماء کے ایک طویل مدتی قبول شدہ اجماع کے ذریعہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے یہ چار مقاصد انسانی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) دھرم (اصولوں پر مبنی انفرادی اور اجتماعی زندگی)

(۲) اَرتھ (دولت اور طاقت کا حصول)

(۳) کام (زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوزی)

(۴) موکش (کرم اور آواگون کے پھندے سے نجات اور ابدی مسرت کا حصول)

ان میں آخری، یعنی موکش کو زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ ہندو قانون کی کتابوں میں کو وَرن آشرم یعنی ذات پات کے نظام (وَرن) اور انفرادی زندگی کے مختلف مدارج (آشرم) کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہندو فقہ اسی وَرن آشرم (دھرم) کے قوانین اور ضوابط کی تدوین و ترتیب کا نام ہے۔

۞۞۞

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ ۵۲

بُدھ مَت

دنیا کی مذہبی تاریخ میں چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں ایسی کئی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے دنیا کی مذہبی تاریخ میں انقلاب پیدا کردیا۔ ہندوستان میں اس صدی کے دوران جین مت اور بدھ مت جیسے دو بڑے مذاہب نے جنم لیا۔ بدھ مت جو اس وقت ایشیا کے بہت سے ممالک کی اکثریت کا مذاہب ہے۔ یہ کبھی اپنے ماننے والوں کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا مذہب رہ چکا ہے، جس کے دائرۂ اثر میں ایشیا کا پورا براعظم شامل تھا، اس وقت جاپان، کوریا، منچوریا، منگولیا، چین، ویت نام، تھائی لینڈ، برما، تبت، نیپال اور سری لنکا میں یہ ایک زندہ مذہب کی طرح پھل پھول رہا ہے۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہی جائے گی کہ جو مذہب ہندوستان میں پیدا ہوا، وہ آج اپنے ہی وطن میں ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے تقریباً ناپید ہے۔ بہر حال بدھ مذہب ہندوستان سے نکل کر جہاں جہاں بھی، اپنے ساتھ اس ملک کی تہذیب کے بعض عناصر کو بھی لیتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن کے نشانات مشرق بعید، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے مقامی تمدن میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔

گوتم بدھ کی پیدائش کے وقت تک ملک میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم

تھیں، جن میں کچھ جمہوریتیں اور کچھ بادشاہتیں تھیں۔ شمالی ہندوستان میں موجودہ نیپال اور اتر پردیش کی سرحد پر واقع شاکیہ نامی ایک جمہوری ریاست تھی، اس ریاست پر شاکیہ نام کا ایک سورونشی چھتری خاندان حکومت کرتا تھا، جس کی سرداری سدّ ودھن نامی ایک شخص کے ہاتھ میں تھی، یہی سدّ ودھن گوتم بدھ کے والد تھے۔

۶۲۳ ق م میں سدّ ودھن کے یہاں گوتم بدھ کی ولادت ہوئی۔ گوتم بدھ کا اصلی نام گوتم سِدّ ھارتھ تھا، ایک جوتشی نے ان کے والد کے دربار میں پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو ایک مشہور سنیاسی بنے گا یا ایک بڑا بادشاہ۔ اس پیشین گوئی کے بعد ایک محفوظ محل میں سدھارتھ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا، اور اس وقت کے رائج ہر ایسے خیال اور اثر سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی گئی جو سنیاس یا ترک دنیا کی طرف راغب کر سکتے تھے۔ اس مخصوص محل میں جو سدھارتھ کی تعلیم و تربیت کے لیے بنوایا گیا تھا، سیر و تفریح اور دل بہلانے کے سارے انتظامات کے ساتھ شہزادہ سدھارتھ کی پرورش شروع ہوئی۔

راجا سُدّ ودھن نے ہر ممکن کوشش کے ذریعہ شہزادے کو رنگ رلیوں اور سیر و تفریح میں الجھائے رکھتے ہوئے اس وقت کا انتظار کیا کہ جب وہ حکومت کے کاروبار کو سنبھالنے کی عمر تک پہنچ جائے، لیکن شہزادے کو بہلائے رکھنے کی یہ ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، اس لیے کہ عمر کے ساتھ ساتھ شہزادے کے یہاں غور و فکر، سنجیدگی اور احساس کی تیزی جیسی خصوصیات بڑھتی جا رہی تھیں، جو راجا کے لیے تشویش کا باعث تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سدھارتھ کو مزید پابندیوں میں الجھانے کے خیال سے ۱۶ سال کی عمر میں ہی ان کی شادی کر دی گئی۔

سارے انتظامات اور کوششیں کارگر ثابت ہوئیں۔ ان کے دل میں حقیقت کو جاننے اور زندگی کے رازِ سربستہ کھولنے کی آرزو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایک رات وہ اپنے رتھ بان کے ہمراہ محل سے باہر نکل گئے، اس لیے کہ محل کی بناوٹی اور پُرتکلف زندگی میں بند رہنا اب سدھارتھ کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس طرح سدھارتھ کو پہلی بار زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ان کے ذہن سے ہر طرح کی غلط فہمی دور ہو چکی تھی۔

روایت کے مطابق شہزادے کے راتوں کے اسفار کے دوران ایک بوڑھے، ایک بیمار اور ایک جنازے کے مشاہدے نے ان پر زندگی کی بے ثباتی اور اس کا غیر اطمینان بخش ہونا واضح کر دیا۔ ان انکشافات کے بعد ایک سنیاسی کی زیارت نے جس کا پُرسکون اور مطمئن چہرہ اس کی اندرونی دولت کی شہادت دے رہا تھا، شہزادہ کو زندگی کے گورکھ دھندے سے نجات کی جدوجہد کا راستہ دکھا گیا، ان مشاہدات نے شہزادے کی زندگی میں گہری غور و فکر اور ایک داخلی کشمکش بیدار کر دی، جس کا خاتمہ ان کے یہاں پہلے لڑکے راہُل کی پیدائش پر ہوا۔ چنانچہ جس دن وہ لڑکا پیدا ہوا اسی رات دیر گئے اپنے بیٹے اور بیوی پر آخری نظر ڈال کر اپنے رتھ بان کے ہمراہ رتھ پر سوار ہو، گوتم شہر سے جنگل کی طرف نکل گئے۔ اپنے تمام ملبوسات اور شاہی لوازمات رتھ بان کے سپرد کر فقیرانہ لباس زیب تن کیا اور جنگل کی تاریکیوں میں گم ہو گئے، اس وقت گوتم کی عمر صرف ۲۹ سال تھی۔

سنیاس اختیار کرنے کے بعد گوتم نے روحانی تشنگی کو مٹانے کے لیے سب

سے پہلے اس وقت کے رائج علوم کا سہارا لینے کی کوشش کی، اس وقت کے بہت سے مشہور علماء سے رابطہ قائم کیا، اور ان علماء سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی جب ان کو تسلّی نہ ہوسکی تو انہوں نے عالموں سے رجوع کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی اور طریقے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے، اور اس وقت کی رائج جسمانی ریاضتوں کے طریقوں کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں سخت جسمانی ریاضتوں کا دور شروع ہوا جسے انہوں نے انتہا تک پہنچا دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب وہ گھومتے گھومتے موجودہ گیا کے پاس اُرآویلا نامی مقام پر پہنچے، جہاں انہوں نے اتنی سخت جسمانی ریاضتیں کیں کہ ان کا جسم ہڈیوں کا پنجر بن گیا، یہاں تک کہ وہ مرنے کے قریب ہوگئے۔ یہ جسمانی ریاضتوں کا طریقہ بھی ان کے گوہرِ مقصود کو پانے کا وسیلہ نہ بن سکا، اور زندگی کا راز ان کے لیے ایک معمہ ہی بنا رہا، اور ابدی مسرت کے حصول میں وہ ناکام رہے۔ چنانچہ اپنی سنیاسی زندگی کو ایک چرواہن کی کھیر کھا کر ختم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ نجات کا راستہ صرف ایک معتدل زندگی کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا ہے، اس فیصلہ کے بعد ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے وہ یہ تہیہ کر کے بیٹھ گئے کہ جب تک وہ ابدی مسرت کے راز کو نہ پالیں گے یہاں سے نہ اٹھیں گے، چنانچہ عہد کرکے وہ اپنے مراقبہ میں غرق ہوگئے۔

آدھی رات کے قریب ان پر اُن چار حقائق کا انکشاف ہوا جن میں بدھ مت کا بنیادی فلسفہ پوشیدہ ہے، یعنی سدھارتھ نے اپنے مراقبہ ہی کے اندر نروانؔ (نجات) حاصل کرلیا، اور اس طرح وہ گوتم بدھ بن گئے کیونکہ اب ان کو ابدی مسرت مل گئی تھی، زندگی کے مسئلہ کا حل انہیں مل گیا تھا اور ان کی ہر خلش دور ہوگئی

تھی۔ نروانؔ حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ گوتم بدھ اسی جگہ مقیم رہ کر، جہاں غور وفکر کے ذریعہ اپنے اعلیٰ روحانی مقام کو مستحکم کر رہے تھے، وہیں ان کے سامنے یہ مسئلہ بھی پریشان کن تھا کہ آیا وہ حاصل شدہ نروان سے پیدا شدہ اعلیٰ کیفیات سے خود ہی لطف اندوز ہوتے رہیں یا دنیا کے لوگوں کو بھی اس راہِ نجات سے باخبر کریں تاکہ وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت وزندگی کے پھندے سے آزاد ہوسکیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد گوتم بدھ کو کامیابی ملی اور وہ اس ہمدردی کے ناتے جو ان کی تعلیمات میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے، دنیا میں اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی تعلیمات کو قبول کرنے والوں میں سماج کے ہر طبقہ اور ہر ذات کے لوگ شامل تھے۔

ان کی تعلیمات اور خیالات کو دیکھنے کے بعد برہمنی مت کی طرف سے ان کی تحریک پر کفر کا فتویٰ لگا، اور اسے ایک ملحدانہ (ناستک) فرقہ قرار دیا گیا۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کی مقبولیت میں ان کے انقلابی رویہ کا بڑا دخل تھا۔

نروانؔ حاصل کرنے کے بعد زندگی کے باقی ۴۵ سال گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کی تبلیغ میں شمالی ہندوستان اور اس کے مشرقی حصہ میں گھوم کر گزارے، اس دوران ان کے ماننے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی، جن میں مرد وعورت یعنی اُپاسک (گھر یا رواج) بھکشو اور بھکشنیاں سب ہی شامل تھے، اس طرح ان کا قائم کردہ 'سنگھ' خوب پھلا پھولا، اس میں خود ان کا بیٹا، بیوی اور وہ ماں جس نے ان کی پرورش کی تھی سب ہی شامل ہو گئے تھے، آخر کار ۸۰ سال کی عمر میں گوتم بدھ کا آخری وقت آگیا اور وہ ان الفاظ کے ساتھ ''بھکشوؤ! اب اس کے علاوہ مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا ہے کہ جو کچھ عناصر کی

ترتیب سے ظہور میں آیا ہے، اس کے لیے فنا مقدر ہے، جی جان سے نروان (نجات) کے لیے کوشش کرلو۔''[1] گوتم بدھ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے، اور بدھ عقیدہ کے مطابق انہوں نے مہا پری نروان حاصل کرلیا۔

بدھ مذہب کی بنیادی تعلیمات

بدھ مذہب کی بنیادی تعلیمات حسب ذیل ہیں:

(۱) لوگ آپس میں محبت سے رہیں۔ کسی پر ظلم نہ کریں، یہاں تک کہ جانوروں کو بھی نہ ستائیں۔

(۲) ہر حال میں سچ بولیں۔

(۳) ماں باپ اور استاد کا حق پہچانیں اور ان کی عزت و خدمت کریں۔

(۴) پیدائش کی بناء پر کسی شخص کو شریف یا رذیل نہ سمجھیں، کیونکہ یہ فرق صرف اعمال پر موقوف ہے۔

(۵) غریبوں، محتاجوں اور بے کسوں کی مدد کریں۔

(۶) ہر معاملہ میں میانہ روی اختیار کریں۔ افراط و تفریط سے بچیں۔

(۷) حلال ذریعہ سے اپنی روزی کمائیں۔

(۸) تپسیا اور برہمنوں کی من گھڑت رسموں کے ذریعہ نجات حاصل کرنے کا خیال ترک کریں۔ خلوص نیت سے نیک کام کریں اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کریں۔

---

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ ۸۳

بدھ مت کی نشوونما

نروان حاصل کر لینے کے بعد مہاتما بدھ نے باقی زندگی اپنے نظریات کی تبلیغ واشاعت میں گزار دی، جس کے نتیجہ میں شمال مشرقی ہندوستان میں ان کے ماننے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔ ان میں دو طرح کے لوگ شامل تھے، ایک وہ گروہ تھا جو زندگی کے کاروبار میں شامل رہتے ہوئے گوتم بدھ کی تعلیمات پر چلنے کا عہد کر چکا تھا، اسی گروہ کو اُپاسک کا نام دیا گیا۔ دوسرا گروہ بھکشوؤں کے نام سے موسوم تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا سے مکمل طور پر اپنا ناطہ توڑ کر حصولِ نروان کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ بھکشوؤں کی اسی جماعت کو سنگھ کا نام دیا گیا، بدھ کی اس دنیا سے جانے کے بعد (پری تروان) بدھ مَت کی تبلیغ واشاعت کا اہم کام اسی سنگھ نے انجام دیا۔

مہاتما بدھ کے بعد ایک ''اجتماع'' کے ذریعہ تعلیمات کو یکجا کر لینے کا اہم فیصلہ اتفاق رائے سے کرا لینے کے بعد جہاں ایک رات بدھ کی تعلیمات مین شرعی قوانین (وِتایا) اور دینیات (دَھمّا) کے حصے مرتب کئے گئے، وہیں سنگھ کے ہاتھوں میں پورے طور پر بدھ مت کی مذہبی رہنمائی آ گئی، جس نے بدھ مت کا مستقبل آئندہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

اور اس طرح بدھ مت ہندوستان میں موجود دوسری مذہبی روایات مثلاً برہمنی مت۔ جین مت وغیرہ کی طرح ایک مذہبی فرقے کی طرح سنگھ کی رہنمائی میں پھلتا پھولتا رہا، گوتم بدھ کے انتقال کے سو سال بعد بنارس میں منعقد ہونے والے دوسرے اجتماع میں بھکشوؤں کی بڑی تعداد میں شرکت، اس کے بڑھتے ہوئے دائرۂ اثر کا واضح ثبوت تھی۔ اگرچہ حلقۂ اثر کے وسیع ہونے کی وجہ سے سنگھ

میں آپسی اختلافات بھی رونما ہونے لگے تھے، اور پھر باقاعدہ سنگھ میں دو طبقات پیدا ہو گئے۔ ایک روایت پسند، اور دوسرا آزاد خیال قرار پایا۔ بعد میں انہیں میں سے مزید فرقے وجود میں آتے رہے، اور آج روایت پسندوں کا ''ہنایان'' اور آزاد خیالوں کا ''مہایان'' مشہور فرقے ہیں۔

ہندستان کا وہ مشہور بادشاہ جو اشوک کے نام سے معروف ہے، موریہ خاندان کا تیسرا بادشاہ تھا جو ۲۷۰ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اس کی کوششوں نے بدھ مت کو ایک ہندوستانی مذہبی فرقہ سے ترقی دے کر ایک بین الاقوامی مذہب بنا دیا۔ بادشاہی جنگجو یانہ پالیسیوں پر مبنی تشدد کے خلاف اشوک نے جس روز بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا، اسی دن سے اس نے اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے خصوصی اقدامات شروع کر دیئے تھے، بادشاہ کی طرف سے ملنے والی مراعات وانعامات اور جاگیروں نے اس کے ماننے والوں یا یوں کہیں کہ بدھ سنگھ میں خوشحالی کا ماحول پیدا کر دیا۔ نئی نئی خانقاہیں وجود میں آئیں، بہت سے بھکشوؤں کو دربار میں رسوخ حاصل ہوا، غرض دھیرے دھیرے بدھ مذہب سرکاری مذہب بنتا گیا، یہاں تک کہ اشوک کی راجدھانی پاٹلی پتر میں تیسرا اہم ''اجتماع'' ہوا، جس میں بدھ مت کی خالص تعلیمات کو تین کتابوں میں مرتب کیا گیا۔ اس طرح بدھ مت کی تعلیمات میں شامل بہت سی بدعات اور دوسری باتوں کو اس سے خارج کر کے یہ اہم کام کیا گیا، اسی ''اجتماع'' کے بعد بدھ مذہب ایک بین الاقوامی مذہب بنتا گیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مذہبی تبلیغی جماعتیں بھیجی گئیں، یہاں تک کہ لنکا، ملایا، جاپان، افغانستان اور چین وغیرہ میں انہیں کافی کامیابی حاصل موئی، غرض اس وقت تک بدھ مذہب ہندوستان

میں ایک بااثر فرقہ بن چکا تھا۔

بدھ سنگھ میں روایت پسندوں اور آزاد خیالوں کی آپسی کش مکش نے جن دو فرقوں کو جنم دیا تھا، ان میں سے ایک فرقہ کی شاخ ''ہنایان'' اپنے مکتب فکر کی واحد ترجمان کی حیثیت سے آج بھی سری لنکا، ہند، چین، برما، ویتنام، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا وغیرہ میں زندہ ہے۔ آزاد خیالوں کی ترجمان ''مہایان'' فرقہ نے بعد کو مذہبی اور فکری، دونوں اعتبار سے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ اس فرقہ نے بدھ مذہب کی بنیادی تعلیمات کی اپنی نئی تشریحات کے ذریعہ ایسی ایسی تعبیرات کیں کہ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں فرقوں میں فرق پیدا ہو گیا۔ مہایان کی آزاد خیالی اور اس کی فکری و مذہبی ارتقا کی وجہ سے ''ہنایان'' اور ''منایان'' کے بیچ کا یہ فرق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بڑھتا گیا۔ مہایان کی نشو ونما میں بدھ مذہب کی نئی نئی تفاسیر، تشریحات، اور اس کی مذہبی لچک یعنی حالات کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی صلاحیت نے بہت اہم رول ادا کیا۔ نیز انہی خصوصیات کی وجہ سے بدھ مت کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی، ہنایان کی روایت پرستی کے راستہ سے الگ، مہایان نے بدھ مت کی ایسی نئی نئی تعبیریں عوام کے سامنے پیش کیں جس کے نتیجہ میں بدھ مت عوام کے مذہبی جزبہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ سمجھا جانے لگا اور اسی لیے روز بروز عوام کا رجحان بدھ مت کی طرف بڑھتا گیا۔

پاٹلی پتر کے تیسرے اجتماع کے بعد بھیجی گئی تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ بدھ مت کو وسط ایشیا اور مشرق بعید میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چین اور جاپان خاص طور پر اس مذہب کے بڑے بڑے مراکز بن گئے، اور ان علاقوں کی تہذیب وتمدن پر بدھ مت نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

تیسری صدی عیسوی سے پانچویں صدی عیسوی تک بدھ مذہب چین، جاپان، کوریا اوران کے اطراف کا مقبول ترین مذہب بن چکا تھا۔

ہندوستان سے باہر جنوب میں بدھ مت کو جس ملک میں سب سے زیادہ مقبولیت اور استحکام حاصل ہوا وہ سری لنکا ہے۔ اشوک کی بھیجی ہوئی ایک تبلیغی جماعت، جس میں خود اس کا بیٹا بھی شامل تھا،[1] کے ذریعہ یہاں نہ صرف عوام بلکہ شاہی گھرانے نے بھی بدھ مت قبول کرلیا، اس وقت سے آج تک سری لنکا بدھ مت کی اکثریت رکھنے والا ایک اہم ملک ہے۔ نہایان کی روایت کو باقی رکھنے، ترقی دینے اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک میں اس کی ترویج واشاعت میں اس نے بڑا کام کیا۔

سنگھ کا مطلب

گوتم بدھ کے شاگردوں میں ابتداہی سے دوطرح کے لوگ شامل تھے۔ ایک تو وہ لوگ جو گوتم بدھ کی تعلیمات کو سچ سمجھ کر قبول کرتے تھے، لیکن اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے اتنی ہمت نہیں کرسکتے تھے کہ دنیا کے دھندوں سے بالکل علاحدہ ہوکر مکمل طور سے نروان حاصل کرنے میں لگ جائیں۔ ایسے لوگ اُپاسک کہلاتے تھے۔

دوسری طرف وہ شاگرد تھے جو گوتم بدھ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنیا سے ناتہ توڑ کر سنیاس لے لیتے تھے اور اپنی پوری زندگی نروان حاصل کرنے کے لیے وقف کردیتے تھے۔ ایسے شاگرد بھکشو کہلاتے تھے، اور بھکشوؤں کی جماعت سنگھ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ جماعت مہاتما بدھ کے ساتھ ہمہ وقت تبلیغی کام

(۱) بحوالہ دنیا کے بڑے مذاہب صفحہ ۱۰۵

میں مشغول رہتی تھی۔

بدھ سنگھ میں روایت پسندوں اور آزاد خیالوں کی باہمی کشمکش نے جن دو بڑے فرقوں کو جنم دیا، ان میں سے پہلے فرقہ کی ایک شاخ ہنایانؔ کے نام سے مشہور ہے، وہ آج بھی لنکا، برما، ہند چین، ویتنام، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا میں پھل پھول رہی ہے۔

آزاد خیالوں کا ترجمان فرقہ، مہایان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فرقہ نے مذہبی اور فکری دونوں اعتبار سے بہت ترقی کی۔ اس فرقہ نے بدھ مت کی بنیادی تعلیمات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی نئی تعبیرات اور تشریحات کیں، یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد ہنایان اور مہایان میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا۔

ہندوستان میں بدھ مت کی ترقی اور اس کا زوال

بدھ مت میں بعد کے دَور میں کچھ اعتقادی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ ان میں سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ بدھ کو الوہیت کا درجہ دیا گیا۔ (۱) مہایان (شمالی بدھ مت) (۲) ہنایان (جنوبی بدھ مت) کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ مہایان گروہ نے بدھ کو آدم بدھ کا درجہ دیا جو بدھوں میں سب سے اول، سب سے زیادہ طاقتور اور یکتا ہے، لیکن ہنایان گروہ نے خود گوتم بدھ کو خدا کا درجہ دے دیا۔ مہایان فرقہ ابتدا سے ایک توحیدی مذہب تھا جو تمام دیوی دیوتاؤں کو ایک بالاتر طاقت کا محکوم قرار دیتا تھا اور خدا کو علت العلل اور کائنات کا اصول اول قرار دیتا تھا۔ اس اصول کے مطابق پہلی علت کو 'دھرم کایا' کے نام سے موسوم کیا گیا جو قانون کے ہم معنیٰ ہے۔ مہایان بدھ مت کے نظریہ کی رُو سے یہ قانون دھرم کایاؔ گوتم بدھ کی صورت میں مجسم

ہوا۔اور گوتم بدھ انسانوں کے ساتھ متحد اور تمام انسان ان کے اندر متحد ہیں۔

بدھ مذہب میں چونکہ تعلیمات عوامی زبان میں تھیں، اس لیے انہیں سب لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اس کے برخلاف برہمنی مذہب کی تعلیمات سنسکرت میں تھی جنہیں لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ دوسرے یہ مہاتما بدھ نہایت مخلص شخص تھے اور سب کی بھلائی چاہتے تھے، اس کے برخلاف برہمنی مذہب میں طبقاتی تقسیم تھی۔ بدھ مذہب میں برہمن، چھتری، ویش اور شودر سب کو برابر کا درجہ دیا گیا تھا، اس لیے بدھ مذہب نے بہت جلد ترقی کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مشہور راجہ اشوک نے بدھ مذہب قبول کرلیا تھا اور اس نے اپنا تمام خزانہ بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کردیا تھا، چنانچہ اسی کے زمانہ میں بدھ مذہب چین، جاپان، برما، سیام، تبت، منگولیا، کوریا، لنکا، منچوریا، ویت نام، تھائی لینڈ وغیرہ تک پھیل گیا تھا۔ بعد میں بدھ میں نفس کشی، ترک دنیا اور اہنسا پر غیر معمولی زور دیا جانے لگا اور بھیک کی روزی، سب سے زیادہ پاک روزی سمجھی جانے لگی۔ جب اچھے لوگوں نے ترک دنیا پر عمل کرنا شروع کردیا تو سارا نظام خراب لوگوں کے ہاتھوں میں آگیا۔ ان باتوں کا سوسائٹی پر خراب اثر پڑنے لگا اور بدھ مت سے لوگوں میں دلچسپی کم ہونے لگی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر برہمنوں نے بدھ مذہب کی مخالفت بڑی شدت سے شروع کردی۔ ان کے مندروں کو توڑ ڈالا اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کو قتل کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس مذہب کے ماننے والے بہت ہی کم رہ گئے۔ ہندوستان میں ۱۲۰ء میں کنشک تخت پر بیٹھا۔ اس نے مہاتما بدھ کو اوتار مان لیا اور اہنسا کو اپنے مذہب میں داخل کرلیا اور لوگوں کو گوتم بدھ کی مورتی پوجنے پر آمادہ کرلیا۔

❁❁❁

جین مَت

جین مَت کے اپنے عقیدہ کے مطابق، یہ ایک ابدی مذہب ہے، جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستانی روایات میں چونکہ دنیا کی کوئی ابتداء یا انتہا نہیں ہے، لہٰذا اس عتبار سے جین مذہب بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہر دور میں وقفہ وقفہ سے ایک کے بعد ایک چوبیس تیرتھنکر (مصلح) پیدا ہوتے رہے اور اس کے احیاء کا کام انجام دیتے رہے۔(۱) آخری تیرتھنکر مہاویر جین تھے، ان کے بعد اب کوئی اور مصلح نہیں آئے گا۔

تاریخی اعتبار سے اس کے ثبوت موجود ہیں کہ مہاویر جین اس مذہب کے بانی نہیں تھے۔ ہندوستان میں یہ روایت پہلے سے موجود تھی۔ خود مہاویر کا خاندان بلکہ ان کی پوری برادری جین مذہب کی ہی پیرو تھی۔ مہاویر نے توسنیاس کے ذریعہ جین مذہب کے مقصد اعلیٰ کو پلیہ کو حاصل کیا اور اس مذہب کے سربراہ بن گئے۔ مہاویر نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں جین مت میں جو اصلاحات کیں، اور اس کی اشاعت اور استحکام کے لیے بحیثیت آخری تیرتھنکر (مصلح) جو اقدامات کئے، اس کی بنا پر مہاویر کو وہ اہم مقام حصل ہوا کہ وہی اس مذہب کے بانی سمجھے جانے لگے۔

---

(۱) آزاد فاروقی 'دُنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۲۹

مہاویر جین مشرقی ہندوستان کے مشہور شہر ویشالی کی ایک قریبی بستی میں ۵۹۹ ق م میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام وردھمان تھا۔ وہ بچپن ہی سے مذہبی غور و فکر کی طرف مائل تھے۔ بڑے ہو کر سنیاس لینا چاہتے تھے مگر والدین کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکے۔ ان کی شادی یشودھا نام کی ایک خاتون سے ہوئی جن سے ایک بچی بھی تھی۔ ۳۰ سال کی عمر میں والدین کے انتقال کے بعد بڑے بھائی نندی وردھن کی اجازت سے سنیاس لیا۔ سنیاس کے دوران جین مت کے مطابق بڑی سخت ریاضتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ترک دنیا کی انتہائی صورت اختیار کرتے ہوئے ستر پوشی سے بھی اپنے کو بے نیاز کر لیا۔ بارہ سال کی سخت محنت کے بعد مہاویر کو معرفت کا اعلیٰ ترین مقام کو پلیہ حاصل ہو گیا، اور وہ وردھمان کی جگہ مہاویر (عظیم بہادر) اور جین (عارف) جیسے القاب سے یاد کئے جانے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے عمر کے بقیہ ۳۰ سال جین مت کی اصلاح اور اشاعت میں صرف کئے۔ اس دوان معتقدین کی ایک بڑی تعداد تیار ہوگئی جن میں ان تیرہ شاگردوں کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہوں نے مہاویر جین کے بعد جین مت کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ شوتامبر فرقے کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں مہاویر جین کا انتقال ہوا۔

جین مَت کے بنیادی عقائد

جین مت کے بنیادی عقائد جن کو سات حقائق کہا جاتا ہے، وہ زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کے حل کے بارے میں سات نظریات ہیں، جن میں جین مت کا بنیادی فلسفہ سمٹ گیا ہے۔ ذیل میں انہیں حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱) جیو (روح) ایک حقیقت ہے۔

(۲) اجیوَ (غیر ذی روح) بھی ایک حقیقت ہے، جس کی ایک قسم مادّہ ہے۔

(۳) اَسرو۔ روح میں مادّہ کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

(۴) نیدھ۔ روح میں مادّہ کی ملاوٹ کے نتیجے میں روح مادّہ کی قیدی بن جاتی ہے۔

(۵) سَمْوَرا۔ روح میں پہلے سے موجود مادّہ کو روکا جا سکتا ہے،

(۶) نرجرا۔ روح میں پہلے سے موجود مادّہ کو زائل کیا جا سکتا ہے،

(۷) موکش۔ روح کی مادّہ سے مکمل علاحدگی کے بعد موکش حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ سات اصول جین دینیات کے وہ بنیادی موضوعات ہیں جن کی تشریح و تفصیل میں جین عالموں نے بھرپور کوششیں کیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں جین فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں کوئی واحد بنیادی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ متعدد حقیقتیں ہیں جو بیک وقت ازلی، ابدی اور بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان بنیادی حقائق کو دو عمومی قسموں میں بانٹ دیا گیا ہے۔

(۱) روح (جیو) (۲) غیر ذی روح (اَجیو)

روح (جیو) اپنی فطرت کے لحاظ سے تمام پسندیدہ صفات کی حامل ہے۔ اس حیثیت میں وہ کرم اور آواگون کے چکر سے آزاد ہے۔ جین مت میں روح کو اُلوہی صفات کا حامل مانا گیا ہے، اور کائنات میں ایسی بے حد اور بے حساب ارواح ہیں، جو اپنی اپنی جگہ ایک مستقل اور آزاد حیثیت کی مالک ہیں۔

اسی طرح غیر ذی روح بھی کائنات میں مستقل اور ازلی حیثیت کی مالک

ہیں، جہاں ارواح لاتعداد ہیں وہاں غیر ذی روح صرف پانچ ہیں، البتہ ان کے مظاہر لاتعداد ہو سکتے ہیں۔ ان غیر ذی روح اشیا میں مادّہ پہلی چیز ہے، جو کائنات مین مختلف شکلوں کے ساتھ ہر طرف دیکھا جا سکتا ہے۔

مادّہ کے علاوہ دوسری چار اشیاء جو غیر ذی روح میں شامل ہیں، ان میں ایک دھرمؔ ہے جسے کائنات میں موجود اصولِ حرکت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جین تصور کے مطابق یہ وہ شے ہے جس کے بغیر کوئی چیز حرکت نہیں کر سکتی۔ یہ خود حرکت نہیں دیتا بلکہ اشیاء کی حرکت کو ممکن بناتا ہے، چنانچہ کائنات میں جو بھی حرکت ہو رہی ہے وہ دھرم کے اصول پر ہی عمل میں آ رہی ہے۔ دھرم بھی ازلی اور ابدی ہے۔ ہاں، نہ تو یہ وزن رکھتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی حجم ہے اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ غیر ذی روح کی تیسری قسم اَدھرمؔ کی ہے۔ یہ کائنات میں سکون کا اصول ہے، یعنی کسی شے کا غیر متحرک اور ساکن ہونا ادھرم کے اصول کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔

آکاشؔ یا فضا غیر ذی روح کی چوتھی قسم ہے۔ فضا اگرچہ خارجی حقیقت ہے مگر تمام اشیاء کے موجود ہونے کے لیے جگہ فراہم کرتی ہے۔ کالؔ یا ''وقت'' بھی جین مت میں غیر ذی روح کی ایک قسم ہے اور ایک بدیہی حقیقت ہے۔ جیو کی نوع میں شامل تمام ارواح اور غیر ذی روح (اجیو) کی پانچوں اقسام جین مت کے لحاظ سے کائنات کی وہ چھ بنیادی حقیقتیں ہیں جو ازلی، ابدی اور مستقل حیثیت کی مالک ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جین مت کثرتِ حقیقت پر یقین رکھنے والا ایک فکری نظام ہے۔

دوسرے مذاہب کی طرح جین مت بھی کرمؔ اور آواگونؔ کے عقیدہ کو تسلیم کرتا ہے، اور موکش حاصل کئے بغیر آواگون کے اختتام کو ممکن نہیں تصور کرتا۔

جین عقیدہ کے لحاظ سے کسی بھی عمل کے لیے اس کی حقیقی محرک خواہشات ہیں، یعنی اعمال کو بے غرض بنانے کے لیے خواہشات پر قابو پانا ضروری ہے۔ اسی لیے جین مت میں باقاعدہ ایک اخلاقی نظام ہے، جو خواہشات پر قابو پانے یا ان کی نفی پر مبنی ہے۔ اس اخلاقی نظام پر عمل کر کے روح میں مزید مادّہ کی آمد کو روکا جا سکتا ہے۔ جین مت میں روکنے کے اس عمل کو سَموَرا کہا جاتا ہے، مگر روح کو مادّہ سے آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اور روح کے چاروں طرف چڑھے ہوئے غلاف کو ختم کیا جائے، تاکہ روح مکمل طور پر آزاد ہو سکے۔ مادّہ کے دور کرنے کا یہ عمل جین مت میں نِرجَرا کہلاتا ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے نفس کش پر مبنی مختلف ریاضتیں کی جاتی ہیں، جن کے ذریعہ روح تمام کثافتوں سے پاک ہو کر اپنی فطری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے، اسی کو موکشؔ کہا گیا ہے۔ مرنے کے بعد ایسی ہی روح جو ہر کثافت سے پاک وصاف ہوتی ہے، کرم اور آواگونؔ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات پاتی ہے۔

جین مت کا ارتقا اور فرقہ بندی

مہاویر جین کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے ان کے تبلیغی جذبہ کو زندہ رکھا اور جلد ہی جین مت اجین اور منڈاسر تک پہنچ گیا۔ ان کے جانشینوں نے شمال میں نیپال اور جنوب میں میسور کا سفر کیا اور وہاں جین مت کا ایک مرکز قائم کیا۔ اسی کے بعد جنوبی ہندوستانی میں جین مت کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشرق میں اڑیسہ کے حکمران راجہ کھارول نے جین مت قبول کرنے کے بعد جین مت کی اشاعت میں بھرپور بھرپور تعاون دیا، اشوک کے پوتے راجہ سمپراتی نے جین مت کی ترقی میں وہی سرگرمی دکھائی جو اس کے دادا اشوک نے

بدھ مت کی ترقی میں دکھائی تھی۔

پہلی صدی قبل مسیح میں مشرقی ہندوستان کے مقابلہ میں جین مت مغربی ہندوستان میں کلک آچاریہ کے ذریعہ فروغ پانے میں میں کامیاب ہوگیا۔ شمال میں مسلم حکومت کے قیام کے وقت تک جنوبی ہندوستان میں جین مَت کے عروج کا دور رہا۔ ساتویں صدی کے بعد جینی اثر جنوب مغرب سے گجرات میں داخل ہوکر ترقی کرتا ہوا راجستھان میں داخل ہوکر پھلا پھولا۔ اس دور میں جین مت کے وہ بڑے رہنما پیدا ہوئے جن کے ذریعہ جین مت کے مذہبی، فکری اور روحانی ارتقا کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ بارھویں صدی میں جین مت گجرات میں علمی اور تمدنی ترقی کے لحاظ سے اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔

جین مت کے دو بڑے اور اہم فرقے جن کی ابتداء پہلی صدی عیسوی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے، دگامبر (دِگ بمعنی فضا، آسمان۔ آمبر بمعنی لباس) یعنی فضا کا لباس پہننے والے اور شوٗتامبر (شوٗ۔سفید، امیرانہ لباس) یعنی سفید لباس پہننے والے سادھوؤں کے نام سے وجود میں آئیں۔ بعض روایات کے مطابق مہاویر جین بھی خود برہنہ رہا کرتے تھے۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں شمالی ہندوستان کے کچھ جینی سادھوؤں نے بعض اندرونی اختلافات کی بناء پر اپنی ایک الگ جماعت اردپھلکا کے نام سے بنا ڈالی تھی، اسی جماعت نے بعد میں تقریباً ۸۰ء کے آس پاس شوٗتامبر فرقہ کی شکل اختیار کرلی (۱)، مگر عقائد اور تعلیمات کے لحاظ سے دونوں فرقوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، علاوہ اس کے کہ دِگامبر برہنہ رہتے ہیں اور شوٗتامبر سفید کپڑ

(۳) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء

ے زیب تن کرتے ہیں، میز مہاویر جین کے حالات زندگی کے بارے میں بھی دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پندرہویں صدی کے آخر میں دِگامبر فرقے کی ایک ذیلی جماعت قارن پنتھیو کا بھی ذکر ملتا ہے، جو مورتی پوجا کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ذات پات کی تفریق کو بھی نہیں مانتے تھے۔ ظاہری رسم ورواج سے زیادہ، ان کے یہاں روحانی اقدار پر زور ملتا ہے۔(۲)

شوٗتامبر فرقے کے یہاں بھی لونکا اور استھانک جیسی ذیلی جماعتوں کا ذکر ملتا ہے، یہ دونوں جماعتیں بھی مورتی پوجا کی مخالف رہی ہیں۔(۳) اٹھارہویں صدی عیسوی میں تیرہ پنتھی کے نام سے ایک اور ذیلی جماعت قائم ہوئی، یہ جماعت بھی بت پرستی کے خلاف رہی ہے۔

جین مت کی اخلاقی تعلیمات

جین مت میں نجات یعنی موکش کا دارومدار کسی غیبی طاقت کے فیصلے یا دیوی دیوتاؤں کی مرضی پر نہیں بلکہ انسان کی ذاتی سعی وکوشش پر مبنی ہے، اسی لیے روح کو پاک وصاف کرنے کے لیے اس مذہب میں ایک تفصیلی لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہے، جو نجات کے ہرخواہشمند کے لیے ضروری ہے۔ یہ اصول وضوابط تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ فرد کی ذاتی اور سماجی زندگی، دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور فرد کی پوری زندگی میں سخت ڈسپلن پیدا کردیتے ہیں۔

جین مت میں وہ لوگ جو مکمل ترک دنیا نہیں کرتے، بلکہ سماجی زندگی سے

(۱) ولاس۔اے۔سنگاوے۔جین کمیٹی اے سوشل سروے بمبئی ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۳

(۲) ولاس۔اے۔سنگاوے۔جین کمیٹی اے سوشل سروے بمبئی ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۵

اپنا تعلق برقرار رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے جین مت کے اخلاقی قوانین کی ایک ہلکی شکل پر عمل کرنا ہوتا ہے، تاکہ وہ آئندہ کے اعلیٰ اخلاقی معیار کے لیے تیار ہوسکیں۔ ایسے سماجی زندگی گزارنے والے جینیوں کے لیے لفظ شَرُ وَک مردوں کے لیے اور شَرُ وِکا عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ ان اخلاقی تعلیمات کو مثالی (مہاورتا) صورت میں اپنانا چاہتے ہیں ان کو مکمل سنیاس لینا ہوتا ہے۔ یسے لوگ سادھو یا سادھوی کہلاتے ہیں۔

نجات حاصل کرنے کے اس عمل کو جین مت میں تین بڑے حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے، جو تری رتن (جواہر ثلاثہ) کہلاتے ہیں، ان تینوں کو جین مت میں:

(۱) سُمیک درشن، (صحیح عقیدہ) (۲) سَمیک گیان، (صحیح علم) اور (۳) سَمیک چرتیہ (صحیح عمل) کہلاتے ہیں۔

سُمیک درشن: تینوں میں سب سے بنیادی اہمیت اسی کو حاصل ہے، اس کی رُو سے جین مذہب کی تمام مذہبی کتابوں، ان کے اکابرین، بزرگوں اور بنیادی سات حقائق، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی کو صحیح عقیدہ تسلیم کیا گیا ہے۔

سمیک گیان: جین مت کے نزدیک اشیاء کی حقیقی ماہیت کے جاننے کو صحیح علم کہتے ہیں۔ یہ علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ سارا باطل علم زائل نہ ہوجائے۔ صحیح علم کی پانچ قسمیں جین مت میں مستند مانی گئی ہیں۔

سمیک چرتر: جین مت میں صحیح عمل یا صحیح کردار کے ذریعہ روح کو مادّے کی قید سے آزاد کرا کر موکش (نجات) حاصل ہوسکتا ہے، لیکن صحیح عمل کا صادر ہونا اسی وقت ممکن ہے جب صحیح علم اور صحیح عقیدہ موجود ہوں۔

جین مت میں انسان کی عملی زندگی کو ایک خاص طرز پر ڈھالنے کے لیے تفصیلی قوانین موجود ہیں۔ جین مت کی اخلاقی تعلیمات میں سب بنیادی اہمیت ان پانچ ورتوں کو حاصل ہے، جن پر ہر جینی کو پوری زندگی عمل کرنے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ ان پانچوں میں چار تو بہت قدیم ہیں، جو مہاویر جین سے پہلے بھی جین مت میں رائج تھے۔ مہاویر جین نے دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ ایک پانچویں بنیادی عہد برہمچریہ (پاک دامنی) کا اضافہ کردیا۔ مہاویر جین سے پہلے شاید اس تصور پر پہلے الگ سے کوئی زور نہیں تھا۔

جین مت کے پانچ بنیادی عہد

(۱) اہنسا، (عدم تشدد) (۲) ستیہ (راست گفتاری) (۳) اَستیہ (چوری نہ کرنا) (۴) برہمچریہ (پاک دامنی) (۵) اَپری گرہ (دنیا سے بے رغبتی)۔ ان پانچ بنیادی عہدوں کے علاوہ گھر بار رکھنے والے جینیوں کو سات اور عہد کرنے ہوتے ہیں، جو انہیں بنیادی عہدوں پر عمل کرنے میں معاون ہوتے ہیں، طوالت کی وجہ سے ان کی تفصیل یہاں نہیں دی جارہی ہے۔

جین مت میں وہ جماعت جو جین سنگھ کہلاتی ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ مردوں کو سادھو اور عورت کو سادھوی کہا جاتا ہے۔ دونوں کو برہمچریہ کی بہت سخت پابندی کرنی ہوتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی جماعتوں کے نظام الگ الگ ہوتے ہیں۔ سنیاس کی ابتداء جین مت کے پانچ بنیادی عہدوں کی شکل میں لینے سے ہوتی ہے، پھر تمام دنیا سے ناتہ توڑ کر بے رغبتی کے ساتھ چند ضروری چیزوں کے علاوہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ مرد سادھو بغیر سلے تین کپڑے اور عورت کو چار کپڑے پہننے کی اجازت ہے، یہ اجازت بھی

صرف شئوتامبر فرقہ کے سادھوؤں کو حاصل ہے، اس لیے کہ دِگامبر فرقہ کے سادھوتو بالکل ننگے رہتے ہیں۔ اس فرقہ میں عورتوں کو سنیاس لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک سادھو اپنے پاس بھیک مانگنے کے دو برتن، ایک جھاڑو، تاکہ بیٹھنے اور سونے سے پہلے اپنی جگہ کو صاف کر لے جس سے کوئی جاندار دب کر نہ مرجائے، کیونکہ جان لینا ان کے یہاں گناہِ عظیم ہے۔ منہ پر باندھنے کا کپڑا اور ایک عصا اپنے پاس رکھ سکتا ہے، اور یہ سب اشیاء اُسے بھیک مانگ کر ہی حاصل کرنی ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اپنی غذاء بھی اس کو ۲۴ گھنٹے میں ایک بار بھیک مانگ کر تیسرے پہر سورج چھپنے سے پہلے کھانی ہوتی ہے۔ ہر جینی سادھو اور جینی سادھوی کو رات میں چلنا پھرنا منع ہے، تاکہ کوئی جاندار پیر سے دب کر نہ مرجائے ورنہ وہ اہنسا کے ورت کی خلاف ورزی ہوگی۔ سر منڈانا تمام سا دھوؤں کے لیے لازمی ہے، بہتر ہے کہ سر کے بالوں کو اکھڑوایا جائے جسے جین مت میں لوچا کہا جاتا ہے۔

جین مت کا کوئی تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے دو بڑے فرقوں دگامبر اور شئوتامبر کا تعارف نہ کرایا جائے، شئوتامبر فرقے کے مطابق اس کی ابتداء شئوبھوتی نامی ایک سادھو سے ہوئی، جس نے کسی بات پر نا راض ہو کر ننگا رہنا شروع کر دیا تھا، اور پھر ننگا رہنے والے سادھوؤں کی جماعت قا ئم ہوگئی جنھوں نے شئوتامبر یعنی سفید کپڑا پہننے والوں کی جماعت سے اپنے آپ کو الگ کرلیا۔ اس طرح یہ دو فرقے یا جماعتیں وجود میں آگئیں مگر عقائد اور تعلیمات کے لحاظ سے دونوں فرقوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، علاوہ لباس کے۔ دگامبر فرقہ عورتوں کو سادھو بننے کی اجازت نہیں دیتا، نیز ان کا خیال ہے کہ عور

تیں آئندہ مرد کی شکل میں جنم لے کر ہی موکش (نجات) حاصل کرسکیں گی۔

یہ لوگ جین مت کی موجودہ مقدس کتابوں کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے مذہب کی تمام اصللی کتابیں مہاویر جین کے چند صدیوں بعد ہی ضائع ہوگئی تھیں۔ ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ موکش حاصل کر لینے کے بعد انسان کھا نے پینے کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہے، وہ بغیر کھائے زندہ رہتا ہے، نیز ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ مہاویر جین نے کبھی شادی نہیں کی تھی، اور وہ اوائل عمر ہی سے سنیاس اختیار کر چکے تھے، جب کہ شئوتامبر کے مطابق ان کی شادی بھی ہوئی تھی اور ان کی ایک بچی بھی تھی۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد ہی انہوں نے سنیاس لیا تھا۔

ہندوستانی مذاہب میں جین مت اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس کے مذہبی رہنماؤں نے مذہبی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم پر بھی اپنی پوری توجہ رکھی، اور ان علوم پر بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف کیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ جہاں بھی گئے، پھلے پھولے، وہاں علم کے چراغ کو روشن رکھا۔ جین فلسفہ اور جین اخلاقی تعلیمات کے علاوہ ڈرامہ نویسی، شاعری، لغت، صرف ونحو، لوک کتھائیں، ناول، موسیقی، ریاضی، علم نجوم، علم ہیئت، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر کثیر کتابیں لکھی گئیں۔ جین عالموں کا مقامی زبانوں کے ارتقاء میں بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

ہندوستانی تہذیب وتمدن میں جنہوں نے فنون لطیفہ کے میدان میں بھی بہت کچھ خدمات انجام دی ہیں۔ فن تعمیر، مجسمہ سازی اور مصوری میں ان لوگوں نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اور ان فنون کو ایک انوکھا اور بلند انداز عطا کی ہے، پہاڑوں کو کا ٹ کر گپھائیں اور غار بنانا اور انہیں مندر کی شکل دینا جینیوں کا انوکھا انداز رہا ہے۔

ہندوستان میں ہر طرف جین مندر کے ایسے نمونے موجود ہیں جن میں فن سنگ تراشی کے بے مثال نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (ماؤنٹ آبو) میں ایلورا کے مندر اس کی بہترین مثال ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ فن مجسمہ سازی ہندوستان کو جینیوں کی ہی دین ہے۔ فن تعمیر اور مجسمہ سازی کی طرح فن مصوری میں بھی جین فنکاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آج بھی اس فن کے قیمتی نمونے مندروں کی دیواروں، کاغذوں، کپڑوں اور تاڑ کے پتوں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

زرتشتیت

دنیا کے بڑے مذاہب میں یہ مذہب کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ یہ قدیم ایران کے زرتشت، جو حضرت دانیال نبی کے شاگرد تھے۔ یہ مذہب انہیں کے روحانی تجربات پر مبنی ہے، اور جنہیں دنیا کے بڑے مذہبی رہنماؤں میں گنا جائے گا۔

مشہور مصری محقق اور عالم ولامہ فرح اللہ ذکی کردی لکھتے ہیں:

''زرتشت کو اللہ تعالیٰ نے قفقاز کے علاقے میں مشہور شہر ''اُرس'' میں نبی بنا کر بھیجا، اس کے بعد زرتشت کی دعوت کا علاقہ قفقاز اور آذربائیجان سے لے کر پورے ایران تک وسیع ہو گیا تھا۔''

عربوں کے ذریعہ فتح ایران اور اسلام کیاشاعت کے بعد اس مزہب کے ماننے والوں کی تعداد میں اتنی کمی آگئی کہ آج صرف ہندوستان میں اس کی تھوڑی سی تعداد موجود ہے جو 'پارسی' نام سے جانے تے ہیں، یا پھر ایک گروہ ایران کے دشوار گزار علاقوں 'یزد' اور 'کرمان' میں آباد ہے۔ اس مذہب کی مقدس کتاب 'اوستا' کے نام سے مشہور ہے، جو زرتشتیت کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ آج اصل کتاب کا صرف چوتھائی حصہ ہی موجود ہے، اوستا کا وہ قلیل حصہ جسے زرتشت پیغمبر کا اپنا کلام کہا جاسکتا ہے، وہ گاتھا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

زرتشتیت اپنے دور عروج میں ایک بڑے سرکاری مذہب کی شکل میں

انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے فلسفۂ زندگی فراہم کرنے اور ان کی زندگی
کا رُخ متعین کرنے میں اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ایک بااثر تحریک ہونے کی وجہ
سے اس دور میں اپنے آس پاس رائج مذاہب پر بھی اس کے اثرات پڑتے
رہے۔ اس طرح زرتشتیت نے فلسفۂ زندگی اور مذہبی فکر سے متعلق کچھ بنیادی
موضوعات جیسے کائنات میں شر کا وجود، خیر و شر کی کشمکش، انسان کی خود مختاری،
اعمال کی انفرادی ذمہ داری، قیامت، حساب و کتاب، اور جنت دوزخ وغیرہ کے
تصور کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے اس سے متعلق سلجھے ہوئے اور واضح تصورات
پیش کئے۔

زرتشت کے جو حالات اوستا سے ملتے ہیں، اس کے مطابق ان کا دائرۂ عمل
اور ان کی مذہبی تحریک کی نشوونما خراسان اور شمالی افغانستان کے علاقوں میں ہوئی
، کیونکہ یہاں ان کو ایک مقامی سردار کی سرپرستی یا حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ زر
تشت خود اس علاقے کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ مغربی ایران کے یارے
نامی علاقے سے یہاں آئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور زمانے کے بارے
میں اختلاف پایا جاتا ہے، پھر بھی خیال ہے کہ شاید ان کی تاریخ پیدائش
۲۶۸ ق۔م اور تاریخ وفات ۵۵۱ ق۔م ہے۔ وہ اپنی کم عمری ہی سے غور و فکر
کے شوقین اور حقیقت کے متلاشی تھے۔ چنانچہ ۱۵ سال کی عمر میں انہوں نے
خلوت نشینی اختیار کر لی تھی، اور ایک لمبے عرصے تک حقیقت اعلیٰ کی تلاش و جستجو
میں جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکتے رہنے کے بعد تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں زر
تشت کو خدائے واحد (رہورامزد) کا مکاشفہ حاصل ہوا، اور تب ہی سے زرتشت
کے پیغمبرانہ دور کا سلسلہ شروع ہوا۔

ساتویں صدی قبل مسیح، زرتشت مجوسیوں کے مذہبی طبقہ میں پیدا ہوئے
تھے۔ ان کا مذہب پہلے بلخ کے علاقہ میں پھیلا، پھر یہاں سے سارے ایران
میں پھیل گیا۔ جس زمانہ میں کہ ساری انسانیت خیالی ہستیوں کی عبادت میں مبتلا
تھی، زرتشت نے ایک معبود حقیقی کی طرف بلایا جس کا نام خالق اکبر تھا اور اس کی
صفات تعداد میں چھ تھیں۔ گاتھا میں ان صفات کو بعض مقامات پر ملائکہ بھی قرار
دیا گیا ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ زرتشت مجوسی تھے۔ یونانیوں نے زرتشت
کو مجوسی قرار دیا ہے۔ مگر مجوسی ثنویت کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خالق دو
ہیں ایک یزدان یعنی خالق خیر اور دوسرا اہرمن یعنی خالق شر۔ لیکن زرتشت وحدا
نیت کے قائل تھے اور یہ پہلے مصلح تھے جنہوں نے وحدانیت کو سحر اور نجوم سے
پاک کر کے خالص اور بے آمیز شکل میں پیش کیا۔

زرتشت کے نزدیک اچھے انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی میں داخل
ہوں گے جن میں نیک اعمال اور اچھے خیالات کا چلن ہوگا۔ اس کے برعکس بُر
ے انسان مرنے کے بعد بُرے اعمال اور خیالات سے دوچار ہوں گے اور
انہیں سزا بھی ملے گی۔ گاتھا کا ایک بڑا حصہ ان سزاؤں پر مشتمل ہے جو گنہگاروں
کو بھگتنی پڑیں گی۔ ان سزاؤں میں سب سے اہم آگ ہے جو بدکرداروں پر او
پر سے برسائی جائے گی۔ بعد کی تفاسیر میں بتایا گیا ہے کہ راست باز لوگ اس
آگ سے اس طرح گزریں گے جیسے دودھ کی نہر میں سے گزرے۔ لیکن بدا
عمال لوگ اس میں جل جائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ اہم تصور ایک پل کا ہے
جو کوہ البرز پر بنا ہوا ہے اور جس کے نیچے دوزخ کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ جب

نیک کردار لوگ اس پل پر سے گزریں گے تو وہ نہایت وسیع ہو جائے گا، لیکن بدا عمالوں کے گزرنے پر وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہو جائے گا۔

زرتشت نے ایمانداری اور راستبازی پر زور دیا ہے۔ زمین کی کاشت اور جانوروں کی پرورش زرتشتی مذہب کی تعلیم میں بہت بڑی نیکیاں شمار ہوتی ہیں۔ اس طرح اس نے ایک محنتی، ایماندار اور خوشحال معاشرہ کی تخلیق کے لیے راہ ہموار کر دی زرتشت کی وفات کے بعد اس کے پیروؤں میں قدیم عقائد پھر اُبھر آئے ۔ویدوں کے عقائد و تصورات اور مظاہر فطرت کی پرستش کا دور دورہ پھر شروع ہو گیا۔ مجوسیوں نے زرتشت کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گویا وہ بھی ساحر اور کاہن تھے، جس کو مستقبل کے واقعات بھانپنے میں خاص مہارت تھی اور اس کی بیوی ایک دیوی تھی۔ نیز یہ تصور بھی پیدا ہوا زرتشت تمام پجاریوں کے سردار اور ان تمام رسوم وشعائر کے موجد تھے جن کی بنا دراصل مجوسیوں نے ڈالی تھی۔ زرتشت کے بعد جادو منتر اور ستارہ شناسی کا رواج دوبارہ شروع ہوا۔ نیز مُردوں کو جانوروں اور پرندوں کے سامنے ڈالنے کا طریقہ پھر رائج ہو گیا۔ اوستا میں ایسے عناصر داخل کر دیئے جن کا گاتھا میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ پرستش کے نئے نئے طریقے رواج پا گئے۔ خدا اور اس کی مخلوق دونوں کو معبودیت کا یکساں درجہ دے دیا گیا۔ گاتھا کو منتر بنا دیا گیا۔ زرتشت نے جادو منتر کو اپنے مذہب سے بالکل خارج کر دیا تھا، مگر ان کا پھر وہی زور ہو گیا۔

نوجوت کی رسم ادا ہو جانے کے بعد ہی ایک زرتشتی بچہ زرتشتی مذہب میں دخل ہوتا ہے۔

زرتشت کی تعلیمات

جدید دور کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اوستآ کے اس حصہ کی تعلیمات، جو گاتھاؤں کے نام سے منسوب ہیں، زرتشت کی اپنی تعلیمات کہی جا سکتی ہیں، کیونکہ بعد کے زمانے میں جو تبدیلیاں آئیں، اس میں زرتشت کی اصل تعلیمات کا بڑا حصہ مسخ ہو گیا۔ بعض مغربی محققین اور خود کچھ پارسی علماء نے بھی اپنی تحقیقات کے ذریعہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔

گاتھاؤں کے مطالعہ سے زرتشت کی تعلیمات میں سب سے نمایاں اور مرکزی اہمیت خدائے واحد کے تصور اور اسی کو معبودِ حقیقی ہونے پر دی گئی ہے۔ اگرچہ اس وقت ایران میں بہت سے اہوراؤں کی پرستش ہوتی تھی، مگر زرتشت نے ان اہوراؤں میں سے اہورامزد (معبود حکیم) کو ہی معبودِ حقیقی اور خدائے واحد ہونے کا اعلان کیا، اور اس کی ایسی صفات اور خصوصیات پیش کیں جن سے صرف اسی کے لیے مالک دو جہاں اور بندگی کے لائق ہونے کا تصور واضح ہو گیا۔ زرتشت نے اہوآرامزد کو کائنات کا خالق۔ مالک دو جہاں، سب کا پالن ہار، قدرت کا مالک، علیم وخبیر، ازلی، وابدی اور سب سے بلند و بالا معبود حقیقی کے طور پر پیش کیا ہے۔ زرتشت نے اہوآرامزد کے سلسہ میں جو تعلیمات پیش کی ہیں، وہ موحدانہ قسم کی ہیں اس بنا پر زرتشت کو توحید کے علمبردار ایک ایرانی پیغمبر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

زرتشت نے اَیک ایسے خدائے واحد کا تصور پیش کیا ہے جو حیّ و قیوم اور کائنات کی تمام چیزوں کا مالک، رحیم و کریم ہے۔ وہ سب سے بڑا انصاف کر

نے والا اور قیامت کے دن لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق اچھا یا بُرا بدلہ دینے والا ہے۔ اہورآمزد کی بعض اہم صفات کو متعین شخصیات کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے، جن کی حیثیت ایسے درمیانی واسطے کی ہے جن کے ذریعہ اہورآمز کائنات کی حکمرانی کے کاموں کو انجام دیتا ہے اس صورت میں یہ شخصیات دینِ اسلام کے فرشتوں سے زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔

زرتشت کی تعلیمات میں دوسرا اہم عنصر، کائنات میں خیر وشر کی باہمی کشمکش کے ایک ہمہ گیر تصور کا ہے۔ زرتشتیت دنیا کے ان مذاہب میں سے ہے جنہوں نے اس مسئلہ کو خصوصی اہمیت دی ہے، اور زندگی کے اس پہلو کو توجہ کا مستحق سمجھتے ہوئے اس سلسلے میں واضح اور تفصیلی تعلیمات پیش کی ہیں۔ یہ موضوع ان کی اکثر تعلیمات میں مختلف صورتوں میں جھانکتا نظر آتا ہے۔ زرتشت کی تعلیمات میں اگرچہ معبودِ حقیقی خیر وشر کی کشمکس سے بالاتر ہے، اور کائنات میں یہ کشمکش اسی کی اجازت سے جاری ہے، پھر بھی اہورآمزد خیر کو پسند اور شر کو ناپسند کرتا ہے۔

زرتشت کی تعلیمات کا ایک اور اہم پہلو جس نے بعض لوگوں کے خیال میں دوسرے مذاہب کو بھی متأثر کیا ہے، وہ انسان کے مرنے کے بعد کی زندگی اور آخرت سے متعلق تصورات ہیں۔ زرتشت نے اس سلسلہ میں اپنی تعلیمات کو بہت واضح طور پر پیش کیا ہے، کہ مرنے کے بعد انسان کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی روح کو ایک پُل سے گزرنا ہوتا ہے، نیک انسان کی روح بہ آسانی اس پر سے گزر جاتی ہے، اور دوسری جانب جنت میں اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہے، بُرے انسان کی روح کو پُل کی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آخر کار پُل سے گر کر دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنا لیتی ہے۔ اس کے علاوہ زرتشت نے ایک

مقررہ وقت پر دنیا کا خاتمہ، مُردوں کا زندہ ہونا، اجتماعی حساب یعنی قیامت کا تصور بھی پیش کیا ہے۔

زرتشت کے نزدیک آگ ایک مخصوص مذہبی اہمیت کی حامل ہے جو اپنی نورانی صفت کے پیشِ نظر اس دنیا میں اہورآمزد کا نشان اور نمائندہ سمجھی گئی، لہٰذا آگ کی تعظیم وتقدیس زرتشت کے نزدیک اہورآمزد سے اپنے تعلق کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ یہی تصور زرتشتی آتش پرستی کی بنیاد ہے۔ آتش کدوں میں آگ کی عبادت کے پانچ اوقات مخصوص تھے۔ البتہ تہواروں کے مواقع پر ان میں خصوصی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ آگ کی عبادت میں ایک خاص نذر اس پر ہوم رسؔ (ہندوستانی سوم) کا چڑھاوا تھا، جو اپنی پیچیدہ اور طولانی رسومات کی وجہ سے دن میں صرف ایک بار ہی ہو پاتا تھا۔ زرتشت کے نزدیک مخلوقات کو اپنے ارادے اور عمل میں پوری آزادی حاصل ہے، اور تمام مخلوقات اپنی مرضی سے خیر یا شر کو پسند کرنے میں مکمل آزاد ہیں ارادے کی یہ آزادی زرتشت کے اس مذہبی رجحان کی دین ہے جس میں اخلاقیات کو ایک نمایاں جگہ دی گئی ہے۔

زرتشت کے نزدیک یہ دنیا دار العمل ہے جہاں خیر اور شر کی کشمکش ہر سطح پر جاری ہے۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں خیر کے مطابق زندگی گزارے، یعنی اپنے لیے خیر کو پسند کرے اور شر کو رد کرے۔ غرض خیر وشر کا یہ موضوع زرتشت کی اکثر تعلیمات میں جھانکتا رہتا ہے، یہاں تک کہ زرتشت کے بعد ان کے ماننے والوں نے کائنات میں خیر وشر کو دو الگ الگ طاقتوں کے سربراہوں کی صورت میں ماننا شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ دو خداؤں پر عقیدہ رکھنے والے قرار پائے۔

ہندوستان میں زرتشتیت کی نشوونما

ایران پر عربوں کی فتح کے بعد ان کے مذہب اور حکومت سے بچنے کی خاطر زرتشتیوں کی ایک جماعت نے خراسان کے پہاڑوں میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ایک لمبا عرصہ گزارا، اور اپنے آپ کو اسلام کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ پھر وہاں سے چھپتے چھپاتے کسی طرح خلیج فارس کی ہُرمز بندرگاہ سے روانہ ہو کر کاٹھیاواڑ کے قریب پہنچے۔ یہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد آٹھویں صدی کے آخر میں گجرات کے مغربی ساحل پر اُترے، جہاں اس وقت جادورانا نامی راجہ کی حکومت تھی۔ کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ راجہ نے ان نئے آنے والے مہمانوں کو ساحل کے قریب قیام کی اجازت دے دی۔ ان لوگوں کو یہاں قیام کے دوران نہ صرف اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ملی بلکہ راجہ کی طرف سے انہیں معاش کے لیے زمیں بھی دی گئی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے کہ زرتشتی پارسی مہاجرین، گجرات اور اس کے آس پاس کے شہروں میں پھیل گئے، اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی حاصل کرتے کرتے صنعت، تجارت اور دیگر شعبوں میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی۔

پندرہویں صدی کے آخر تک ہندوستان کے یہ پارسی چند مسائل میں جزوی تبدیلیوں کے علاوہ اسی زرتشتیت پر عمل پیرا رہے جو زمانہ قدیم یعنی ساسانی عہد میں رائج تھی۔ جدید مذہبی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستانی پارسیوں نے اپنے ایک نمائندہ کو ایران بھیج کر ایرانی زرتشتیوں سے اپنے اس قدیمی رشتہ کو پھر تازہ کیا جو تقریباً سات صدیوں پہلے منقطع ہو گیا تھا۔ مذہبی صلاح مشہور کا یہ سلسلہ تین صدیوں تک جاری رہنے کے بعد پھر بند ہو گیا۔ دورِ جدید

میں ایک بار پھر یہ رشتہ قائم کیا گیا، جو آج تک قائم ہے۔ ہندوستان میں اس وقت پارسیوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ کے آس پاس بتائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں یورپی اقوام کے آتے ہی ان پارسیوں نے ان کے ساتھ گہرے تجارتی اور صنعتی تعلقات قائم کر لئے، جس کی مدد سے پارسیوں نے معاشی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی اور ہندوستان کی سب سے خوشحال جماعت بن گئی، نیز انگریزوں سے اپنے قریبی مراسم کی بنیاد پر ہندوستان کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں مغربی تعلیم وتربیت اور تہذیب وتمدن کے اثرات ان پر سب سے زیادہ پڑے۔ غرض ان لوگوں نے اس پورے دور میں معاشی اور تعلیمی، ہر میدان میں غیر معمولی ترقی حاصل کرتے ہوئے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا۔ صنعت وتجارت اور مختلف علوم وفنون میں اس قوم نے ملک کو بعض نامور شخصیات فراہم کیں۔

۞ ۞ ۞

سکھ مت

خدائے واحد کی عقیدت ومحبت کے ساتھ پرستش کی روایت ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کے آس پاس سری کرشن نے واسودیو کی پرستش کی صورت میں جس مذہب کی تبلیغ کی تھی، وہ یہی بھکتی کا مسلک تھا۔(۱) دوسری صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بھگوت گیتا میں پہلی بار بھگتی مت کو ایک مستقل اور منظّم مسلک عبودیت کے طور پر ضابطۂ تحریر میں لایا گیا۔ اس زمانہ میں اس تحریک میں ایسے بہت سے روحانی بزرگ پیدا ہوئے جو خدائے واحد کے لیے بہت سے ہندی اصطلاحات والے نام جیسے رام، ہری اور سوامی وغیرہ کا استعمال کرتے تھے لیکن اس سے مراد خالقِ کائنات کی ذات ہی تھی۔

عہد وسطیٰ کی پوری بھکتی تحریک، ہندوستانی اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لین دین اور میل ملاپ سے ایک ایسے انقلابی نتیجہ تک پہنچ گئی جو ہندوستانی معاشرہ کی مذہبی زندگی کے لیے بہتر ثابت ہوا۔ ہندومت اور اسلام دونوں کے مذہبی رہنماؤں نے ظاہری رسومات اور اعمال کو حقیقت اعلیٰ تک پہنچنے میں رکاوٹ گردانتے ہوئے اس تعلیم پر زور دیا کہ ذاتِ خداوندی کا عرفان انسان کے اپنے جزبۂ اخلاص اور خدا سے قلبی تعلق پر مبنی ہے، نہ کہ مذہبی اعمال اور رسومات پر۔ اس طر

(۱) آزاد فاروق، صوفی ازم اینڈ بھکتی، نئی دہلی ۱۹۸۴ء صفحہ ۴۰۔۳۶

ح عشق حقیقی کو سچی مذہبیت کا حاصل قرار دیا گیا۔ بے نفسی، ایثار، ہمدردی، خدمت خلق اور خاکساری جیسی مسلک عشق کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہری احکامات اور رسومات کی جگہ باطنی کیفیت کی اصلاح اور خدا سے قلبی تعلق پر زور دینے کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی ذات پات کی تقسیم کی شدت سے مخالفت کی گئی۔

یہی وہ بھکتی کا ماحول تھا جو اسلامی عہد کے ہندوستانی معاشرہ پر اثر انداز ہورہا تھا۔ دوسری طرف صوفیا کے مختلف سلسلے جو ہندوستان میں ہر طرف پھیل چکے تھے، وہ بھی عملاً اپنے مشاہدات اور مذہب کے باطنی تجربات پر زور دینے میں بھکتی تحریک کے سنتوں سے زیادہ مختلف نہ تھے۔

غرض یہی وہ مذہبی ماحول تھا جس میں سکھ مت کے بانی گرونانک جی نے آنکھیں کھولیں، اور پھر اپنے عشق حقیقی کے ذاتی تجربات اور مذہبی احساسات کی شدت کی بنیاد پر بھکتی مت کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

حالات زندگی اور تعلیمات

گرونانک صاحب سکھ مذہب کے بانی تھے۔ ان کی پیدائش ۱۵/اپریل ۱۴۶۹ء میں لاہور سے تقریباً پچاس میل جنوب مغرب میں ایک گاؤں تل ونڈی میں ہوئی تھی جو اب ننکانہ صاحب کہلاتا ہے۔ وہ بیدی کھتری خاندان کے فرد تھے۔ گرونانک نے ابتدائی عمر میں سنسکرت اور ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کا علم حاصل کیا اور اس وقت کے عام دستور کے مطابق گاؤں کی مسجد کے مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کا مذہبی رجحان روز بروز نمایاں ہوتا گیا۔ ان کے والد مہتہ کالو گرونانک کے مذہبی

انہماک کو دیکھتے ہوئے ان کے دنیوی مستقبل کے بارے میں بہت پریشان تھے۔مگر گرونانک کاروباری زندگی سے احتراز کرتے رہے۔

تعلیمات

سلطان پور میں گرونانک جی کو جو مرکزی روحانی تجربہ ہوا تھا، اس کا سب سے پہلا شعری اظہار 'مول منتر' کی شکل میں ہوا۔سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کے سارے کلام میں مول منتر (بنیادی کلمہ) کو سب سے مقدس سمجھا جاتا ہے۔مول منتر کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ گرونانک جی کا عقیدۂ توحید، اسلامی نظریۂ توحید سے مختلف نہیں تھا، جیسے:

ایک اونکار، ست نام کرتا پُرکھ نربھو نرویر

(خدا ایک ہے) (اسی کا نام سچ ہے) (وہی قادر مطلق ہے) (وہ بے خوف ہے) (اسے کسی سے دشمنی نہیں

اکال مورتی اَجوتی سہبھن گرپرساوی

(وہ ازلی اور ابدی ہے) (بے شکل وصورت ہے) (قائم بالذات ہے) (خود اپنی رضا اور توفیق سے حاصل ہوتا ہے)

گرونانک نے کسی شریعت کی پابندی اور ظاہری قوانین کی اطاعت کے مقابلے میں تقدیرِ الٰہی پر راضی رہنے پر زور دیا ہے۔یعنی کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے، اس لیے خدا کی مرضی کے مقابلے میں اپنی مرضی اور خواہش کو ختم کر کے راضی بہ رضا رہتے ہوئے ہی انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔'جپ جی'، سکھوں کے یہاں تقدیس میں 'مول منتر' کے بعد دوسرا درہ رکھتا ہے۔گرونانک جی نے عشق الٰہی کے حصول کے لیے انسان کو انانیت سے چھٹکارا پانے پر بہت زور دیا ہے۔انانیت کے علاوہ گرونانک نے بعض دوسری نفسانی خرابیوں مثلاً کام (خواہشات) لوبھ (لالچ) موہ (دنیا سے تعلق) کرودھ

(غصہ) وغیرہ کو بھی اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ان کے خیال میں ان اندرونی بیماریوں سے نجات پائے بغیر عشق الٰہی کا حصول مشکل ہے۔سکھ مت میں سب سے بنیادی چیز، جس کو سکھ کا طریقِ عبادت بھی کہا جا سکتا ہے، نام سمرن یا ذکر الٰہی ہے۔یہ خدا کا نام لیتے رہنے کا ایک عام طریقہ ہے، نام سمرن کے لیے بعض لوگ چھوٹی تسبیح کا بھی استعمال کرتے ہیں۔تاہم سمرن کا سب سے اہم اور مفید طریقہ کیرتن کی شکل ہے، جس میں باجماعت موسیقی کے ساتھ گرنتھ صاحب کے کلام کا ورد ہوتا ہے۔

نام سمرن کے علاوہ جو چیزیں گرونانک کے نزدیک عشق الٰہی حصول میں معاون ہوتی ہیں، ان میں سادھو سنگت، سیوا، ایمانداری کی روزی، انکسار اور مخلوق سے محبت اور ہمدردی جیسی صفات شامل ہیں۔گرونانک رُہبانیت کے سخت مخالف تھے۔کرم اور آواگون کو بھی گرونانک جی تسلیم کرتے تھے۔ان کے خیال میں جب تک انسان عشق الٰہی میں کمال حاصل کر کے خدا کو نہیں پا لیتا، وہ بار بار اسی دنیا میں جنم لیتا رہے گا۔اس طرح ان بے شمار زندگیوں کی تعداد ۸۴ لاکھ بتائی جاتی ہے۔

گرونانک صاحب کی تعلیم میں گرو کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے یعنی خدا تک پہنچنے کے لیے ایک پیرومرشد کی ارادت ضروری ہے جس کی رہنمائی اور تعلیم خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ثابت ہو۔

'گرونگد' نے گرونانک صاحب اور دوسرے صوفی سنتوں کا کلام لکھنے کے لیے سکھوں کا اپنا رسم الخط 'گورمکھی' ایجاد کیا اور گرونانک صاحب کے ایک پرانے ساتھی بالا کے ذریعہ گرونانک صاحب کی ایک سیرت مرتب کرائی جس میں ان کی

تعلیمات کی تلخیص بھی موجود تھی۔

سکھوں میں دس گرو ہوئے ہیں جن میں زیادہ مشہور تیسرے گرو امرداس ہوئے جنہوں نے سکھ عقیدتمندوں کو منظم کرنے کے لیے ان کو بائیس منجیوں (حلقوں) میں تقسیم کر دیا اور ہر حلقہ کے لیے ایک آزمودہ کار اور روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ سکھ کو بطور سربراہ اور اپنا نائب مقرر کر دیا، جنہوں نے بعض عوامی خدمات بلاتفریق مذہب وملت انجام دیں۔

چوتھے گرو رام داس نے سکھوں کی شادی اور مرنے کی رسومات ہندو مذہب سے الگ متعین کیں۔ نیز ستی کی رسم کی مخالفت کی اور بیواؤں کی شادی پر زور دیا اور ایک قدرتی پانی کا چشمہ اکبر بادشاہ سے حاصل کر کے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس چشمہ کو ایک بڑے تالاب کی شکل میں تبدیل کرا دیا۔ بعد میں یہ تالاب امرتسر (چشمۂ آب حیات) کے نام سے مشہور ہوا، اور شہر کا بھی یہی نام پڑ گیا۔ گرو رام داس کے بعد گرو کا عہدہ ان کی اولاد میں موروثی ہو گیا اور بعد کے گروؤں میں مذہبی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دنیاوی بادشاہت کا تصور بھی شامل ہو گیا۔

پانچویں گرو، گرو ارجن سنگھ نے گرو گرنتھ صاحب تیار کی اور امرتسر کے تالاب میں سکھوں کے لیے ایک مرکزی عبادت گاہ ''ہری مندر'' کی تعمیر کی، جسے اب ''دربار صاحب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گرو ارجن سنگھ نے سکھوں سے دسونتھ (عشر) وصول کرنے کا انتظام کیا اور اس کی وصول کے لیے ہر حلقہ (منجی) میں ایک عامل مقرر کیا اور تین مزید شہر، ترن تارن، کرتار پور اور ہر گوبند پور آباد کئے۔ پھر جہانگیر بادشاہ وقت سے مخالفت ہو گئی تو جہانگیر نے گرو ارجن کو قتل کرا دیا اور ان کا مال واسباب ضبط کرا لیا۔ اس کے بعد گرو ارجن کے

صاحبزادے گرو ہرگوبند کے دور میں سکھ جماعت، ایک مذہبی ملت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے کھل کر سامنے آگئی۔ گرو گوبند نے تخت نشینی کے وقت اپنے داہنے اور بائیں طرف ایک ایک تلوار رکھی اور کہا کہ ایک تلوار ''میری'' کی ہے اور دوسری ''فقیری'' کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے تمام معتقدین کو مسلح رہنے کا حکم دیا۔ انہیں تین مرتبہ پنجاب کے مغل گورنر سے لڑنا پڑا اور ہر مرتبہ گرو ہرگوبند کامیاب رہے، مگر اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر امرتسر کی رہائش ترک کر کے شمال مشرق کے علاقہ میں ایک باغی راجہ کے پاس چلے گئے۔

نویں گرو تیغ بہادر ایک صلح پسند اور صوفی منش آدمی تھے اور اپنے کو تیغ بہادر کی بجائے دیغ بہادر کہلوانا پسند کرتے تھے جس سے مراد سخاوت اور مہمان نوازی تھی۔ وہ دس سال زندہ رہے۔ اورنگ زیب نے انہیں دلی بلوایا اور سکھ روایات کے مطابق مسلمان ہونے سے انکار کرنے پر انہیں قتل کروا دیا۔ چنانچہ سکھوں کو بہت زیادہ غصہ آیا اور دسویں گرو گوبند سنگھ جو گرو تیغ بہادر کے صاحبزادے تھے، مغل حکومت کے سخت مخالف ہو گئے۔ وہ علم وفن، شاعری، وجنگ، شہسواری، مردانگی اور جرأت میں طاق تھے۔

گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو منظّم کرنے کے لیے باضابطہ ارادت (پاہُل) کا سلسلہ شروع کیا۔ وفاداری کے سخت ترین امتحان کے بعد سب سے پہلے پانچ سکھ جو مختلف ذاتوں کے تھے، ایک مخصوص رسم کے ذریعہ جو ''امرت چکھنا'' کہلاتی ہے، مریدین کے حلقہ میں داخل ہوئے اور ''خالصہ'' کہلائے۔ اس کے بعد مجموعی داخلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد ہزاروں سکھ ''خالصہ'' میں داخل ہوئے اور گرو گوبند سنگھ نے کچھ شرعی قوانین بھی بنائے، مثلاً تمباکو سے پرہیز، حلال

گوشت سے ممانعت، مردوں کے لیے اپنے نام ''سنگھ'' (شیر) اور عورتوں کے لیے ''کور'' (شہزادی) کا استعمال کیا اور پانچ چیزوں کا جو ''ک'' سے شروع ہوتی ہیں رکھنا ضروری قرار دیا، یعنی ''کیس'' (بال)، کنگھا، کڑا (ہاتھ میں پہننے کا)، ''کچھ'' (جانگھیہ) اور ''کرپان'' (تلوار)۔

خالصہ کی تشکیل کے بعد ہی گرو گوبند سنگھ نے مغل سلطنت سے لڑنے کے لیے فوجی کارروائیاں شروع کردیں اور پہاڑی علاقہ کی مختلف ریاستوں میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا، مگر وہاں کے راجاؤں نے مغل حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے سے انکار کردیا تو ان ریاستوں پر گرو گوبند سنگھ نے حملہ کردیا۔ ان راجاؤں نے اورنگ زیب کے دربار میں شکایت کردی کہ گرو گوبند سنگھ مغل حکومت کے خلاف باغیانہ کارروائیاں کررہے ہیں۔ اورنگ زیب نے سرہند کے حاکم کو گرو گوبند سنگھ کی تنظیم کو ختم کرنے پر مامور کیا۔ حاکم سرحد نے جو فوجی اقدامات کیے، ان سے گرو گوبند سنگھ کی فوجی قوت پارہ پارہ ہوگئی اور ان کے خاندان کے تمام افراد بھی کام آگئے اور گرو گوبند سنگھ نے بھیس بدل کر زندگی کے آخر ایام دکن میں گزارے، جہاں دو افغانیوں نے انہیں زخمی کردیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لاکر انتقال کرگئے۔

اپنے انتقال سے پہلے انہوں نے طے کردیا تھا کہ اب آئندہ کوئی آدمی سکھوں کا گرو نہ ہوگا، بلکہ ان کی کتاب گرنتھ صاحب ہی ان کے لیے ہمیشہ گرو کا کام کرے گی۔ اس کے بعد سکھ سرداروں نے مختلف سیاسی حلقے قائم کرلیے جو مِسل کے نام سے مشہور ہیں، اور جمنا سے سندھ تک کے علاقہ میں ایک طرح سے ان مِسلوں کی ایک سکھ ریاست ہائے متحدہ بن گئی۔ اس کے بعد سکر چکیا

مسل کے ایک وارث رنجیت سنگھ نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ضم کرکے ایک وسیع علاقہ میں جو کشمیر سے صوبۂ سرحد تک اور دریائے ستلج سے ملتان تک اپنی واحد حکومت قائم کرلی اور مہارانا کا لقب اختیار کیا۔ ستلج سے مشرق کی سکھ ریاستوں نے انگریزی حکومت کی پناہ لے لی۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد خانہ جنگیوں اور سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان دو لڑائیوں کے بعد مہارانا رنجیت سنگھ نے تمام علاقہ پر قبضہ کرلیا۔

بابا گرونانک دیو کی تعلیمات میں ہمیں حسب ذیل باتیں بھی ملتی ہیں:

(۱) آپ نے نماز کا حکم فرمایا۔[۱]

(۲) آپ نے روزہ رکھنے اور پانچ نمازوں کا حکم فرمایا۔[۲]

(۳) آپ نے ختم نبوت پر ایمان لانے کا حکم فرمایا۔[۳]

(۱) 'جنم ساکھی' بھائی بابے والی وڈی صفحہ ۲۲۱

(۲) گرنتھ صاحب سری راگ مجلہ صفحہ ۲۴

(۳) جنم ساکھی صفحہ ۱

یہودیت

عبرانی نسل نے اپنی تاریخی روایات کی جتنی حفاظت کی ہے۔اس کی مثال کسی اورقوم میں نہیں ملتی ۔ یہودیوں میں اپنے تاریخی تسلسل کا شعور سب سے زیادہ قوی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بدویانہ خانہ بدوشی کی زندگی سے لےکر فلسطین میں آباد ہونے اور پھر مختلف ملکوں میں منتشر ہونے اور طرح طرح کے آفات ومصائب کا شکار ہونے کے باجود،ان کی مذہبی کتابوں میں روایات کا ایک بےنظیر تاریخی تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کا تاریخی شعور نہایت بیدار تھا۔ یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں جو تاریخی حالات درج ہیں وہ کم وبیش،اغلاط کے باوجود واقعیت سے خالی نہیں ہیں۔ کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے آباواجدادانہیں خانہ بدوش قبائلسے تعلق رکھتے تھے جوحضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دوہزار سال پہلے شمالی عرب اور ملحقہ مما لک میں پھرا کرتے تھے۔

بنی اسرائیل کے آباواجدادعراق کے باشندے تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدایک بابلی شہر'اُر' کے رہنے والے تھے۔ یہاں سے وہ شمال مغربی عراق کے ایک شہر میں ہجرت کر کے منتقل ہو گئے تھے۔

یہودیت کا تاریخی ارتقاء

بعض نئی تحقیقات کے لحاظ سے یہودی مذہبی روایات کا سلسلہ ایک

قدیم سلسلہ ہے جوحضرت ابراہیم جیسے بزرگ سے جاملتا ہے۔اسلام،عیسائیت اور یہودیت، ان تینوں مذاہب میں قدامت کے لحاظ سے یہودیت کو اولیت حاصل ہے،اوردنیا کی مذہبی روایات میں یہودیت سب سے زیادہ تاریخی شعور بھی رکھتی ہے۔تمام مذہبی کتابوں میں یہودیوں کی کتاب توریت میں سب سے زیادہ تاریخی واقعات پائے جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے مطابق دنیااوران کی اپنی قومی تاریخ خدا کی ہی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہے، اسی لیے وہ لوگ اپنے آس پاس کی قوموں کے عروج وزوال، فتح وشکست، کامیابی وناکامی، سب میں یہ لوگ خدا کا ہاتھ دیکھنے کے عادی تھے، کیونکہ ان لوگوں نے خدا کو تاریخ کے ذریعہ ہی پہچانا تھا۔ان کے خیال میں خدا نے ابتداء سے ہی اپنے آپ کو انسانی تاریخ سے وابستہ کردیا تھا، اسی لیے بنی اسرائیل تاریخ کے ہر واقعے کو خدا کے فعال اور حاضروناظر ہونے کی علامت سمجھتے تھے۔

دنیا کی تاریخ سے زیادہ، بنی اسرائیل خدا کو اپنی قومی تاریخ میں کارفرما دیکھتے تھے، کیونکہ خدا نے حضرت ابراہیم پر اپنے ظہور کے ساتھ ہی اپنے آپ کو ان کے خاندان سے ایک عہد کے ساتھ خصوصی طور پر جوڑ لیا تھا۔

''جب ابرام ۹۹ (ننّاوے) برس کا ہوا تو خدا تعالیٰ ابرام کو نظر آیا، اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں، تو میرے حضور چل اور کامل ہو، اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تیری نسل کو بڑھاؤں گا۔''

توریت یعنی عہد نامہ قدیم کی اسی عبارت میں اس عہد کو اور مزید ان الفاظ میں واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

''میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے

درمیان ان کی پشت در پشت کے لیے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد
ہے، کرتا ہوں کہ میں تیرے اور تیرے بعد تیری نسل کا
خدا ہوں گا۔'' (۱)

یہودیوں کے مطابق یہ خصوصیت ان کو دوسری تمام اقوام سے ممتاز کر دیتی ہے، اور یہی عہد بنی اسرائیل کو مصیبت کی تاریکیوں میں روشن چراغ کا کام کرتا ہے، بنی اسرائیل کا خدا کے اس عہد پر پختہ یقین ہی ان کو آج تک تمام تباہیوں اور بربادیوں سے بچاتا آرہا ہے۔ ان کا اس بات پر آج بھی پختہ یقین ہے کہ حضرت ابراہیم سے کئے گئے عہد کے مطابق وہ خدا کی سب سے چہیتی اور مخصوص قوم ہیں۔

توریت کے مطابق، یہودی تاریخ کی ابتداء بھی خدا اور حضرت ابراہیم کے اسی براہ راست تعلق سے ہوتی ہے جس کا اوپر مختصراً کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم کے بعد ان کی اولاد کی ایک شاخ، ان کے بیٹے حضرت اسماعیل سے متعلق ہے۔ اسی نسل میں ہمارے پیارے نبی پیدا ہوئے۔ یہودی روایات کے مطابق حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسحاق کی اولاد ہی اس عہد کی وارث بنی جو خدا نے حضرت ابراہیم سے کیا تھا۔ حضرت یعقوب، جو حضرت اسحاق کے بیٹے تھے، خدا نے ان کو اسرائیل کے لقب سے نوازا، اسی لیے آج تک ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو یہودی روایت میں سب سے بڑے پیغمبر کی

(۲) 'دی ہولی بائبل' اردو ترجمہ کتاب پیدائش، باب ۲۲، صفحہ ۱۵
۲ ایضاً صفحہ ۱۸

حیثیت رکھتے ہیں، سے پہلے تک بنی اسرائیل چند قبائل کی ایک ملی جلی آبادی کا نام تھا۔ وہ حضرت موسیٰ کی ہی ذات تھی کہ جس نے ان کو ایک مکمل شریعت اور خدا سے ایک عہد کے ذریعہ ان کو آئندہ کے لیے مستقل ایک قوم بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی حضرت موسیٰ کو ہی اپنے مذہب کا بانی اور سب سے بڑا نبی مانتے ہیں۔

توریت کی آخری آیات میں حضرت موسیٰ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے، ''اور آج تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں ہوا جس سے کہ خدا تعالیٰ منہ در منہ سامنے ہوتا تھا۔(۲)

حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے دریائے اردن کے پار۔ کنعان میں داخل ہو کر اس کے وسطی پہاڑی علاقے پر قابض ہو کر اسے اپنا مرکز بنالیا۔ دھیرے دھیرے بنی اسرائیل اپنے اس علاقے کے وہ حصے جو مغرب کی پہاڑی سلسلے اور بحر روم کے ساحل کے درمیان زرخیز میدان کی حیثیت سے مشہور تھے، ان پر فلسطینیوں کا قبضہ تھا، جو ایک جنگجو قوم تھی۔ وہ بنی اسرائیل سے اکثر برسرِ پیکار رہتے تھے، یہاں تک کہ کنعان پر قابض ہو کر اسرائیلیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ اس شکست اور فلسطینیوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے بنی اسرائیل کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ نسلی و مذہبی وحدت کی اس کمی کو دور کر کے جب تک ہم کوئی مرکزی سیاسی تنظیم قائم نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم ان حملہ آوروں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اسی احساس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ نسلی و مذہبی وحدت کی اس کمی کو دور کر کے جب تک ہم کوئی مرکزی سیاسی تنظیم قائم نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم ان حملہ آوروں کی طاقت کا مقابلہ نہ

(۱) 'دی بائبل' باب ۳۴، صفحہ ۱۲-۱۰

کر سکیں گے۔اسی احساس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کی یہ نئی حکومت حضرت داؤد کے قبضہ میں آگئی جو طالوت کے داماد تھے۔ان کی رہنمائی میں بنی اسرائیل نے کافی ترقی حاصل کی، نیز اپنے آس پاس کے علاقوں پر قابض ہو کر اپنے علاقے کو وسعت دے ڈالی۔حضرت داؤد کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان ان کے حکمراں ہو گئے تھے۔ان کے دورِ حکومت میں بنی اسرائیل تجارتی، صنعتی اور تعمیراتی ترقی کے لحاظ سے انتہائی عروج حاصل کر چکے تھے۔

حضرت سلیمان کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر بنی اسرائیل، دو الگ الگ حکومتوں میں بٹ گئے۔ان میں سے ایک اسرائیل اور دوسری یہودہ کے نام سے مشہور ہوئی۔کچھ عرصہ بعد سیریا اور بابل کے بادشاہوں نے نہ صرف اسرائیلی اور یہودہ، دونوں ریاستوں کو تباہ و برباد کر ڈالا، بلکہ یروشلم کو بھی پوری طرح اُجاڑ دیا، اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے آئے۔اس واقعہ کے بعد یہودیوں کے یہاں جو مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا وہ دورِ جدید تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔اور یہ لوگ کسی نہ کسی قوم کے ماتحت زندگی گزارتے رہے، اور ایک آزاد خود مختار حکومت کا تصور ان کے لیے ایک خواب بن کر رہ گیا۔

۵۳۹ ق۔م میں جب ایرانیوں نے بابل فتح کر لیا تو ایک بار پھر یہودیوں کو آزادی حاصل ہوئی، اور وہ یروشلم جا سکے، مگر ایرانیوں کے دورِ اقتدار میں یہودیوں کی یہ تمام آسانیاں صرف اسی وقت تک قائم رہیں جب تک کہ سکندر نے ایران کو فتح نہیں کیا۔سکندر کی فتح کے بعد یہودی قوم کا اطمینان کے ساتھ گزر بسر کرنے کا دور ختم ہو کر یونانیوں کی ماتحتی کا دور شروع ہوا۔یہودی قوم نے ایرانی حکومت کے دور میں مذہبی، سماجی اور تہذیبی، ہر طرح کے اثرات ایرانیوں سے

قبول کئے، چاہے وہ اثرات ایران کے زرتشتیوں سے لیے ہوں یا ان کی سماجی زندگی سے لیے گئے ہوں، اس لیے کہ بابل کی اسیری سے پہلے ان کے یہاں ایسے بہت سے وہ اثرات نہیں تھے، جو اس کے بعد ان کے یہاں ملتے ہیں۔ سکندر کے بعد اس کی حکومت اس کے سرداروں کے درمیان تقسیم ہو کر مختلف حکومتوں کی شکل میں بٹ گئی، آپسی رقابتوں اور رنجشوں نے ان کے درمیان خانہ جنگی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔یکے بعد دیگرے ہر حکومت فلسطین پر اپنا قبضہ کرتی اور اس کو نقصان پہنچاتی رہی، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آ گیا جب فلسطین اور وہاں کی یہودی آبادی رومیوں کے زیرِ نگیں آ گئی، مندرجہ بالا تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی قوم مغربی ایشیا کے مختلف حصوں میں سکونت پذیر ہونے لگی۔

فلسطین پر رومیوں کے قبضہ کے بعد اس کا سیاسی نظام رومیوں کے پاس رہا، مگر وہاں کی یہودی آبادی کا خیال کرتے ہوئے ایک یہودی سربراہ یہودیوں کے مذہبی اور اندرونی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔اسی پس منظر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی اور ان کی مختصر تبلیغی زندگی کے بعد رومی نگراں اور یہودی سربراہ کے عہد ہی میں حضرت عیسیٰ کو ملزم قرار دے کر مصلوب کر دیا گیا۔

رومی سلطنت اپنے وقت کی ایک طاقت ور حکومت تھی۔اپنی سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تہذیبی اور تمدنی روایات میں کسی دوسرے کو اپنا مدِّ مقابل نہیں گردانتی تھی۔فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد مظالم روا رکھنے کے ساتھ ساتھ ایسے قوانین بھی وہاں نافذ کر دیئے جو خاص طور پر یہودیوں کی شریعت اور معاشرت سے میل نہیں کھاتے تھے۔اس صورت حال نے یہودیوں میں ایک طرح کی بے چینی اور بے قراری پیدا کر دی تھی۔رومی شہنشاہ کی پرستش کا نیا

مسلک یہودیوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل عمل تھا، کیونکہ یہ براہ راست ان کے مذہبی عقیدہ سے ٹکراتا تھا۔

ان ہی تمام حالات سے نجات پانے کی غرض سے یہودیوں نے ۶۶ء میں اپنی آزادی کی پہلی تحریک کا آغاز کیا، جو کچھ مدت جاری رہنے کے بعد رومی حکمرانوں کے ذریعہ کچل دی گئی، پھر بھی یہودی قوم نے اپنی آزادی کی تحریک کے سلسلہ کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھتے ہوئے ایک آخری کوشش ۱۳۲-۱۳۵ء کے درمیان کی، جس میں انہیں کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی، مگر اس کے بعد رومی سلطنت نے ان کی اس تحریک کو اس طرح کچلا کہ ایک ایک یہودی کو تلاش کر کے قتل کر ڈالا گیا، اور یروشلم کو یہودیوں سے پاک کر کے ایک رومی طرز کا شہر بنا دیا گیا، جگہ جگہ رومی دیوتاؤں کے عبادت خانے تعمیر کر دیئے گئے۔ اس وقت یہودیوں کے لیے یروشلم کے قریب جانا بھی موت کو گلے لگانے کے برابر تھا۔ اس حادثہ کے بعد حالات نے یہودیوں کو ساری دنیا میں منتشر ہو کر مہاجرانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان تمام حالات کے باوجود یہودی کسی وقت بھی اس تصور سے غافل نہیں رہے کہ ان کا اصل وطن فلسطین ہے، جو انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یہی وہ تصور تھا جس نے یہودیوں میں یروشلم واپس جانے کے جذبے، اور وہاں اپنی مستقل و پائیدار ریاست کے قیام کی خواہش نے ایثار و قربانی کے جذبہ کو ختم نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی ترقی نے یہودیوں کو ایک بار پھر مجتمع ہونے کا موقع فراہم کر دیا، یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں یہودیوں کے ایک وطن کے تصور کو تسلیم کرتے ہوئے برطانیہ نے اس کے قیام کا پورا پورا یقین دلا کر

یہودیوں کو مطمئن کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اقوام متحدہ کے فیصلہ کے مطابق فلسطین کی تقسیم اور ایک یہودی خود مختار ریاست کے قیام کے تصور کو لے کر یورپ سے یہودی مہاجرین کا ایک سیلاب فلسطین کی طرف امنڈ پڑا۔ فلیسطین میں ان نو آباد یہودیوں نے اپنے آپ کو ہر سطح پر منظّم کر کے ایک خود اعتماد اور خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان کو اس بدویت کے ماحول میں جس چیز نے ایک ممتاز مقام عطا کیا وہ ان کا مخصوص مذہبی شعور تھا۔ حضرت ابراہیم کے بعد ان کی اولاد کی ایک شاخ ان کے بیٹے حضرت اسماعیل سے قائم ہوئی، پیغمبر اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی شاخ سے تھا، لیکن یہودی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم سے خدا کے عہد کے وارث اور خاندان کے مذہبی سربراہ ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب ان کے جانشین ہوئے، جن کو خدا نے اسرائیل کے لقب سے نوازا۔ آج تک ان کی اولاد اسی لیے بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت یعقوب کے ایک بیٹے حضرت یوسف جب مصر میں ایک باحیثیت شخص کی صورت اختیار کر گئے تو حضرت یعقوب اپنی تمام اولاد کے ساتھ مصر میں آ کر آباد ہو گئے۔ تاریخ داں بنی اسرائیل کے متذکرہ بالا بزرگوں کے وجود کو تو حقیقی مانتے ہیں، مگر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت یوسف کے دور میں تمام بنی اسرائیل مصر آ گئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک حصہ بدستور فلسطین ہی میں قیام پذیر رہا، اور اس نے مسلکِ ابراہیمی اور ان قربان گاہوں کے مذہبی شعائر کو قائم رکھا جو ان کے اجداد نے خدائے حق کی نذر کے لیے قائم کی تھیں۔ (۱)

(۱) آزاد فاروقی 'دنیا کے بڑے مذاہب' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۳۸

۱۳۰۲۔۱۲۹۰ق۔م کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا۔ ان سے پہلے بنی اسرائیل مختلف قبائل پر مشتمل ایک آبادی کا نام تھا۔ یہ حضرت موسیٰ کی ہی ذات تھی جس نے اسرائیل کو ایک مفصل شریعت اور خدا سے من حیث القوم ایک عہد میں باندھ کر ان میں وہ اتحاد اور یکجہتی پیدا کر دی جس سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک مستقل قوم بن گئے۔ حضرت موسیٰ ہی کے ذریعہ بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ یہودی روایت کے مطابق تمام نبیوں میں وہی ایسے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ بالمشافہ گفتگو کرتا تھا۔ ان کو جھاڑی کی آگ میں اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ یہودی حضرت موسیٰ کو اپنے مذہب کا بانی اور نبیوں میں سب سے بڑا مانتے ہیں۔

یہودی کسی ایک کتاب کو مقدس نہیں تسلیم کرتے، بلکہ مستند صحیفوں کے ایک مجموعے کو مقدس تسلیم کرتے ہیں، جسے ''کتابیں'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں شامل صحیفے مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں کے ذریعہ مرتب کئے گئے ہیں۔ بائبل کا پہلا تین چوتھائی حصہ انہیں ''کتب'' پر مشتمل ہے، جو عہد نامۂ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں توریت کہلاتی ہیں، اور حضرت موسیٰ کی مرتب کردہ سمجھی جاتی ہیں۔ انہیں میں وہ حصہ بھی شامل ہے جسے ''احکام عشرہ'' کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک یہ خدا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو حضرت موسیٰ کو کوہِ طور پر دیا گیا تھا۔

توریت کو عہد نامۂ قدیم میں سب سے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی شریعت انہیں میں درج ہے۔

یہودی مذہب کی بنیاد دو عقیدوں پر ہے۔ اولاً خدا کی وحدانیت، دوم بنی اسرائیل کے ساتھ خدا کا مخصوص تعلق۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی اولاد سمجھتے ہیں۔

یہودی عقیدہ کی رو سے عالم کائنات، خیر ہے اور انسان حصول خیر کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا مختار اور ذمہ دار ہے۔ وہ ایمان کی بہ نسبت اعمال کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔ اس طرح یہودیت، صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات ہے جو انسانوں کے ہر عمل کو رضائے الٰہی کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ حق اور باطل، خیر اور شر کے معیار کو یہودی صرف عبادت تک محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ زندگی کے ہر گوشہ اور اعمال کی ہر شاخ میں ان تصورات سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کا مذہب ایک مکمل و مفصل ضابطۂ حیات ہے۔ مثلاً ایک معمولی سا مبالغہ یا ادنیٰ سی دل آزاری بھی یہودیوں کے نزدیک ایک عظیم ترین گناہ ہے، ان کے لیے مذہباً ممنوع ہے کہ وہ فحش کلامی کریں، یا کسی کو اشتعال دلائیں، یا کسی کمزور اور لاچار آدمی کے سامنے غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کریں۔ ہر یہودی پر فرض ہے کہ وہ دن میں تین بار نماز ادا کرے، کھانے سے پہلے دعاء شکرانہ پڑھے۔ زندگی کی ہر لذت و مسرت پر شکر کا اظہار کرے۔ ہر روز کتاب مقدس کی کچھ آیات تلاوت کرے۔ صبح کی نماز کے وقت یہ لوگ ایک خاص لباس پہنتے تھے۔

یہودی رسوم وشعائر اور قوانین کی ضابطہ بندی کا کام قدیم یروشلم اور بابل میں انجام دیا گیا تھا۔ روایات کا درجہ ان کے یہاں کتب مقدسہ سے کم نہ تھا۔ جب حفظ کردہ روایات کا ذخیرہ بہت زیادہ ہو گیا تو ان کی ترتیب وتبویب اور کتابت ضروری ہو گئی۔ اس ضمن میں جو مبحث پیش آئے، انہیں بھی لکھ لیا گیا۔ یہ سارا مجموعہ ''تالمود'' کہلاتا ہے۔ ''تالمود'' کی ترتیب کا کام دو مختلف مذہبی درسگاہوں میں ہوا تھا۔ چونکہ ان دونوں کا طریق استدلال اور طریق تاویل جدا

جدا تھا، اس لیے ''تالمود'' کے دو مجموعے تیار ہو گئے۔ ایک فلسطین کی ''تالمود'' اور دوسری بابل کی ''تالمود''۔ یہودیوں نے دونوں کو برابر کا درجہ دیا لیکن اختلاف رائے کی صورت میں بابل کی ''تالمود'' کا درجہ بلند تر ہے۔

یہودیوں کے مذہبی احکام میں سے شریعت اور قانون کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر کا حکم سب سے زیادہ اہم ہے۔ عبرانی زبان کا بیشتر لٹریچر قانون اور شریعت کی توضیح و تفصیل سے متعلق ہے۔ یہودی پر مذہباً فرض ہے کہ اپنی اولاد کو قانون کے مبادی سے روشناس کرائے۔ یہودی مذہب، رسوم و شعائر کی پابندی کو دین کا مدار قرار دیتا ہے۔ ان کے مذہبی احکام میں سے شریعت اور قانون کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر کا حکم سب سے زیادہ اہم ہے۔

❁❁❁

عیسائیت

عیسائی مذہب کی بنیاد ان عقائد پر ہے جنہیں حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور شاگردوں نے حضرت عیسیٰ کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اپنانا شروع کر دیا تھا۔ عیسائی مذہب کی مقدس کتابیں جو جدید عہد نامہ کے مجموعہ میں شامل ہیں، عیسائیت اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس مجموعہ میں چار اناجیل شامل ہیں، یعنی انجیل بہ روایت متّی انجیل، بہ روایت مرقس، انجیل بہ روایت لوقا اور انجیل بہ روایت یوحنّا۔ یہ اناجیل حضرت عیسیٰ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے تقریباً ۳سال بعد سے لے کر اَسّی سال بعد تک لکھی گئیں۔ ان کے مرتبین میں لوقا اور مرقس حضرت عیسیٰ کے براہ راست حواریوں میں سے نہیں تھے، بلکہ یہ حواریوں کے ساتھی تھے۔

لوقا کی انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ کی پیدائش اس زمانے میں ہوئی جب قیصر روم اغستس نے فلسطین میں مردم شماری کا حکم دیا تھا۔ جب حضرت مریم کے یہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو اس واقعے کو انجیلوں میں صرف لوقا نے ہی بیان کیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم نے اس پیدائش کے بعد اپنے منگیتر یوسف سے شادی کر لی، اور حضرت عیسیٰ کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ دونوں حضرت داؤد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، اور دونوں ہی اتنے غریب

تھے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں مقدس ہیکل میں قربانی کے لیے جانور کی جگہ دو کبوتر پیش کئے، کیونکہ اس سے زیادہ کی ان کے یہاں گنجائش نہ تھی۔ حضرت عیسیٰ چونکہ ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے وہ یہودی روایات سے اتنے زیادہ واقف تھے کہ ان کے شاگرد انہیں لفظ ربی کے نام سے پکارتے تھے، جو کہ یہودی عالموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی شخصیت اتنی غیر معمولی اور پُر اثر تھی کہ دنیا سے ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کے شاگردوں (حواریوں) اور عام عیسائی مذہب سے متعلق لوگوں نے انہیں نہ صرف یہاں ایک ''مسیح'' کا انتظار انتہائی شدت سے کیا جا رہا تھا، یہاں تک کہ یہودیوں کے عیسیٰ کے ایک رشتہ دار حضرت یحییٰ جو حضرت زکریا کے بیٹے تھے، بہت سے لوگوں نے ان کے بعض رویّوں کی وجہ سے ان پر ''مسیح'' ہونے کا شک کیا، مگر حضرت یحییٰ نے خود اس کی تردید کی اور اپنے پیچھے مسیح کے آنے کی خبر دیتے ہوئے خود کو اس کا خادم ظاہر کیا۔ حضرت عیسیٰ کی اس غیر معمولی شخصیت کا اظہار عمر کے آخری تین برسوں میں ان کی نبوت کے دور میں ہوا۔

نبوت مل جانے کے بعد حضرت عیسیٰ نے باقاعدہ اپنی تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا، اور پھر دھیرے دھیرے ان کے حواریوں کی تعداد بڑھنے لگی، اور ساتھ ہی عوام الناس میں بھی رجوع الی اللہ کی دعوت کا کام شروع کر دیا گیا۔ اناجیل کے مطابق ان کی تعلیمات سے زیادہ لوگوں پر ان کے وہ معجزات اور اشارات اثر انداز ہوئے جو وہ اپنے مواعظ کے ساتھ دکھاتے رہتے تھے، اور جو بطور ''مسیح اور ابن اللہ'' ان کی حیثیت کو زیادہ اجاگر کرتے تھے، اس لیے یہودی علماء اس رجحان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، نیز حضرت عیسیٰ کا عوام سے بڑھتا ہوا رابطہ بھی

یہودیوں کے اعلیٰ طبقہ میں حضرت عیسیٰ کے خلاف ناراضگی کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعہ جس کامیابی کی طرف عوام الناس کی رہنمائی کرنا چاہ رہے تھے، وہ قطعی روحانی اور غیر ارضی تھی، جب کہ یہودی اس دنیا میں مادی کامرانی کے خواب دیکھ رہے تھے، شاید اسی لیے وہ ان کے مسیح ہونے کو بھی اپنے تصور مسیحیت کا مذاق سمجھتے تھے۔ اُدھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے آخری دنوں میں پہلے سے کہیں زیادہ زور سے اپنی تعلیمات کو پیش کرنا اور یہودی رہنماؤں پر تنقیدیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ اسی وجہ وہ لوگ حضرت عیسیٰ سے اس قدر برہم ہوئے کہ ان کو صلیب پر چڑھانے سے کم پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ وہ اسی فکر میں رہتے تھے کہ وقت عوام کی دست رس سے محفوظ رہتے ہوئے کسی وقت حضرت عیسی کو ختم کر دیں۔ آخر کار وہ وقت آ گیا اور اناجیل کے مطابق رومن حکمران کے اشارے پر یہودی علماء، عوام اور سرکاری اہلکاروں کے ذریعہ انہیں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

عیسائیت کی بنیادی تعلیمات

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے اکلوتے بیٹے تھے اور الوہیت میں شریک تھے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث پرستی پر مبنی ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس، یہ تینوں مل کر ایک ہیں (تھرِی اِنْ وَنْ۔ اینڈ وَنْ اِنْ تھرِیْ) اگرچہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول موجود ہے کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم فرماتے تھے۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر مار ڈالا گیا۔

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت تک پیدا ہونے والے عیسائیوں کے

گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مصلوب ہوئے۔

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا ہر ایک کا باپ ہے اور ہر شخص بلا واسطہ اس سے خطاب کرسکتا ہے اور اس سے محبت کرسکتا ہے۔ اس کے لیے نہ کسی جگہ کی قید ہے اور نہ وقت کی (میتھو ۔۶:۱) نماز، خیرات اور روزہ وغیرہ چیزیں پبلک میں شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں ہیں، بلکہ اپنے باپ سے ذاتی تعلق کو ترقی دینے کے لیے ہیں۔

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سامعین کو یقین دلایا کہ خدا بحیثیت باپ، ہر شخص کی خبر گیری کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنے اس باپ کی عنایت حاصل کرنے کے لیے نا اہل نہیں ہے۔ کوئی شخص بھی آسمانی مملکت سے مستثنیٰ نہیں کیا جائے گا۔ (میتھو ۷:۷۔۸)

(۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات دو نظریوں کے گرد گھومتی ہیں ایک تو خدا کا باپ ہونا اور دوسرے تمام انسانوں کی اخوت۔ ٹھیک جیسے باپ اپنی تمام اولاد سے محبت کرتا ہے، اسی طرح ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے محبت کرنی چاہیے، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔ (لیوک ۶:۳۲۔۳۶) انھوں نے فرمایا کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو (میتھو ۵:۴۳۔۴۸)

(۷) قاتل، سماج کے ٹھکرائے ہوئے اور دشمن تک سے ایسی محبت کرنا جیسی اچھے آدمیوں سے اور محبت کے لائق لوگوں سے محبت کی جاتی ہے، خدا سے محبت کرنے کے ہم معنیٰ ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ننگوں کو کپڑا پہنانا، اجنبیوں کا استقبال کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا، قیدیوں سے ملاقات کرنا، خدا سے

محبت کرنے اور اس کی خدمت کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ (میتھو ۲۵:۲۴۔۴۶)

(۸) انسان کی زندگی کا مقصد خدائی اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہے یعنی محبت کرنا، رحم کرنا اور سب سے پیار کرنا۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں خدا سے محبت کرتا ہوں اور اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ کیوں کہ جو شخص اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتا جسے اس نے دیکھا وہ خدا سے محبت نہیں کرسکتا جسے اس نے نہیں دیکھا۔ (جان ۴:۷۔۲۰)

عیسائی مذہب نے بہت سے عقائد واعمال، یہودی مذہب، رمیوں اور بعض دوسرے مذاہب کے اپنے یہاں شامل کر لیے۔ ہفتہ وار اجتماع 'سبت' کی عبادت کو یہودیوں سے لیا۔ یونانی ثقافت سے عیسائی علماء نے منطقی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیاں لیں اور رومی ثقافت سے قانون اور نظم کے لیے ایک مرکزی جماعت کا تصور لیا اور اسی نہج پر ایک مذہبی جماعت یعنی چرچ کی بنیاد ڈالی۔

عیسائی چرچ کا ارتقاء

عیسائیوں میں مستعمل لفظ چرچ یونانی اکلیسیا (کلسیا) کا مترادف ہے، چرچ یا کلیسا کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً اس کے ایک معنیٰ تو اس عمارت کے ہیں جہاں عیسائی عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں، دوسرے عیسائی امت کے لیے ھی کبھی کبھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نیز یہ لفظ عیسائی مذہبی رہنماؤں کی جماعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ مذہبی جماعت جو عیسائیوں کے مذہبی امور میں ان کی سربراہی کے لیے ذمہ دار ہوتی ہے۔ عیسائیت کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً عیسائیت جو

ایک یہودی فرقے کی طرح ہی ابھری تھی، وہ بعد کی صدیوں میں ایک عالمی مذہب کی شکل اختیار کر گئی اور آج دنیا میں سب سے زیادہ اسی مذہب کے ماننے والے ہمیں ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اس دنیا سے جانے کے تھوڑے ہی عرصہ میں عیسائیت فلسطین کے علاوہ رومی سلطنت کے مختلف شہروں چھوٹی مچھوٹی جماعتوں کی شکل میں قائم ہو چکی تھی۔ یہ ساری جماعتیں اپنی روز مرہ کی زندگی میں مقامی حواریوں میں کی پابند ضرور تھیں، مگر ساتھ ہی وہ دوسرے شہروں کے اپنے عیسائی بھائیوں کے ساتھ اپنے دینی رشتہ کا پورا احساس بھی رکھتی تھیں۔

تاریخی اعتبار سے روم میں عیسائیت کی ابتداء کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، مگر حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عیسائیت کی شروعات ان یہودی عیسائیوں سے ہوئی جو فلسطین اور روم کے درمیان آتے جاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ روم میں باقاعدہ عیسائی جماعت وجود میں آ گئی۔ جیسا کہ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں، اگرچہ اس وقت تک روم میں کسی حواری کے آنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا، مگر چند ہی برسوں میں بہت سے مذہبی رہنما روم پہنچ چکے تھے، بلکہ حواریوں کے رہنما پطرس (پٹیر) بھی روم پہنچ گئے۔

جس طرح سے ہم نے دیکھا کہ عیسائیوں کی جماعتیں مختلف علاقوں اور شہروں میں رہنے کے باوجود دینی اخوت کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی تھیں، اسی طرح عیسائی مذہبی رہنماؤں نے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو تمام عیسائی جماعتوں کا نگران اعلیٰ تصور کیا، جس کا اظہار یہ لوگ ابتداء سے ہی کسی نہ کسی شکل میں کرتے آ رہے تھے۔ تقریباً دوسری صدی عیسوی میں یہ تصور بھی قائم ہو گیا

تھا کہ ہر علاقے کی عیسائی جمعیت اس علاقے کے مرکزی چرچ سے متعلق ہو گی، جس کا سربراہ 'بشپ' کہلاتا تھا، اور جو اپنے علاقے کی ساری جماعتوں کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس نظام کے قیام کے بعد سے جب بھی عیسائی قوم کے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو مختلف علاقوں کے ''بشپ'' کی جماعت کو ہی یہ اختیار تھا کہ وہ مختار اعلیٰ کی حیثیت سے فیصلے کرے۔ مذہبی رہنماؤں یعنی ''بشپ'' (بطریقوں) کی یہی انجمن رومی چرچ کے سربراہ کو بھی منتخب کیا کرتی تھی، جو عیسائیوں کا سربراہ اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے، اور وہ ''پوپ'' کے نام سے مشہور ہے۔ مقامی بشپ اپنے علاقے کی جماعتوں کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا تھا۔ مقامی پادریوں کی جماعت اس کی مددگار رہتی تھی، اور اس کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں ہی عیسائیت پھیل کر دنیا کے نئے نئے علاقوں تک پہنچ چکی تھی، اور مغربی ایشیا، جنوبی یورپ اور شمالی افریقہ میں باقاعدہ ایک قابل لحاظ مذہبی تحریک بن چکی تھی۔ رومی سلطنت کے مغرب و مشرق میں تقسیم ہو جانے کے بعد مغربی سلطنت کے شہنشاہ قسطنطین نے اپنی تخت نشینی کے وقت خود کو نہ صرف عیسائی مسلک کا پیرو قرار دیا بلکہ عیسائیت اور عیسائیوں کا طرف دار بھی ظاہر کیا۔ اس کے بعد آنے والے شہنشاہوں نے عیسائیت کو باقاعدہ رومی حکومت کا واحد مذہب قرار دے کر باقی دوسرے تمام مذاہب کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔ اس تاریخی فیصلہ نے عیسائیت اور عیسائی چرچ کو زبردست طاقت عطا کی۔ اس وقت سے عیسائیت کا مرکزِ ثقل، رومی سلطنت کی راجدھانی روم بن گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی عبادت گاہوں سے اپنی تبلیغ

شروع کی ۔ پہلے تو یہودیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلہ سے وابستہ اور انہیں کی روایات پر عمل پیرا تھے، لیکن جب انہوں نے ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد سے بے تکلفی کے ساتھ ملنا شروع کیا تو یہودیوں کو ناگوار گزرا خصوصاً فرانسیسیوں کو کیونکہ وہ لوگ تمام بے دین لوگوں سے کنارہ کش رہتے تھے اور اپنی جسمانی پاکیزگی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اصرار تھا کہ بے دین اور گنہگاروں کو بھی آسمانی بادشاہت میں حصہ دار بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ماننے والے یہودیوں کی عبادت گاہوں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے مگر ایک دن جب پطرس نے یہودیوں کے معبد یروشلم میں ایک جذامی کا مرض دور کر دیا تو وہاں کے پجاریوں نے پطرس سے سوال کیا کہ تم نے کس کے نام سے مریض کو اچھا کیا۔ پطرس نے کہا کہ میں نے عیسیٰ مسیح کے توسط سے اس مرض کو دور کیا اس پر معبد کے پجاریوں کو معلوم ہوا کہ گلیلی کے جس باشندے کو صلیب پر سولی دی گئی تھی، یہ لوگ اس کے ماننے والے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو منع کیا کہ وہ معبد کی حدود میں اپنی مذہبی تبلیغ کا سلسلہ بند کر دیں۔ اس کے بعد حواریوں سے کچھ اور واقعات صادر ہوئے جس کی وجہ سے یہودی بڑی تعداد میں عیسائی مذہب اختیار کرتے گئے۔ جب ان کی تعداد بڑھی تو ان کی تنظیم کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ چنانچہ بہت جلد لیڈروں اور رہنماؤں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا۔ یہ لوگ رسول کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد بارہ تھی۔ یہ ایک طرح کی کمیٹی تھی جو اپنے اندرونی معاملات کا تصفیہ کرتی تھی۔

بہت جلد اس نئے گروہ میں یونانی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہوگئی جن کی زبان یونانی تھی، اور ان کی تہذیب بھی یونانی تھی، ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو فلسطین کے باشندے نہ تھے بلکہ ان علاقوں کے باشندے تھے جہاں یونانی تہذیب اور زبان کا تسلط تھا۔ ان یونانی عیسائیوں نے اپنی جماعت الگ بنالی۔ یہ لوگ اپنے اجتماعات علاحدہ کرتے تھے اور اپنی جماعتی تنظیم کے لیے سات اسقف مقرر کئے۔ ابھی تک مسیح کے ظہور ثانی کا عقیدہ فلسطین کی حدود سے باہر نہیں پہنچا تھا، لیکن جب یونانی یہودیوں نے عیسائیت قبول کی تو انہوں نے فلسطین کے باہر بھی اپنی تبلیغ شروع کر دی اور ایک علاحدہ مذہب کی حیثیت سے عیسائیت کی بنیاد ڈالی۔ یونانی یہودیوں نے جب عیسائی مذہب قبول کیا تو انہوں نے بڑے پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ خود فلسطین اور یروشلم میں بھی علی الاعلان عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگے۔ ان کے سات اسقفوں میں سے سب سے زیادہ سرگرم اور پُرجوش اسٹیفن تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے یروشلم کی یونانی عبادت گاہوں میں عقیدۂ مسیح اور ان کے ظہور ثانی کا عقیدہ پیش کیا۔ یروشلم کے ارباب اقتدار نے ان جدید مبلغین کے خلاف سرکاری کارروائی کی کیونکہ اسٹیفن نے صاف صاف بتایا تھا کہ مسیح کی آمد اور آسمانی بادشاہت کے قیام کے بعد یہودیوں کے مذہبی رسوم وشعائر اور ان کے دینی قوانین کی حیثیت میں تبدیلی آجائے گی۔ یہودی عدالت عالیہ کے سامنے اسٹیفن کا مقدمہ پیش ہوا۔ چنانچہ اسٹیفن کو موت کی سزا دے دی گئی۔ اس کے بعد یونانی یہودی عیسائیوں کے لیے یروشلم میں جماعتی حیثیت سے اپنا، یا اپنے عقائد کی تبلیغ کرنا ناممکن ہوگیا اور یروشلم سے اسٹیفن کی جماعت کو نکال

دیا گیا۔ اس جماعت نے رومی سلطنت کے گوشہ گوشہ میں عیسائیت کا پیغام پہنچایا۔ ان لوگوں نے یونانی نقطۂ نظر سے اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کی۔ ان کی مذہبی تبلیغ کا سب سے پہلا مرکز انطاکیہ تھا۔ یہاں بہت سے غیر یہودیوں نے عیسائی مذہب قبول کیا اور عیسائیت کی اصطلاح انطاکیہ کی اسی جماعت سے شروع ہوئی۔

سینٹ پال عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد اسی جماعت میں مل گیا۔ سینٹ پال اور برناباس نے یہودی عبادت گاہوں سے اپنی تبلیغ شروع کردی۔ یونانی اور رومی مشرکین میں ان کی تبلیغ بہت مقبول ہوئی۔ رومی دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ جتنی مقبول ہوتی گئی، اسی نسبت سے یہودیوں کو اس خطرہ کا احساس بڑھتا گیا کہ عیسائیت اب ایک مستقل دین کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور جب حضرت عیسیٰ کے یہودی پیروکاروں نے یروشلم میں اپنی علاحدہ جماعت قائم کرلی اور جب اسٹیفن نے اس جماعت کی سربراہی کی تو یہودیوں نے اسٹیفن کو قتل کرادیا۔ اور یونانی عیسائیوں کی جماعت کو یروشلم سے نکال دیا۔ لیکن یونانی عیسائیوں نے یروشلم سے نکل کر رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں اپنی تبلیغ کا جال بچھا دیا اور یہودی صوامع میں اپنی تبلیغ شروع کردی۔ پھر یہودی صوامع سے عیسائیوں کا اخراج ہونے لگا۔ سب سے پہلے انطاکیہ کے صوامع سے عیسائیوں کا اخراج ہوا اور رفتہ رفتہ دوسرے علاقوں سے بھی اخراج ہونے لگا۔ مگر روم کی سلطنت میں عیسائیت کو اتنا فروغ ہوا کہ ۴ء میں رومی شہنشاہ کانس ٹن ٹائن نے عیسائی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے دیا، لیکن ۶۴ء میں رومی شہنشاہ نیرو نے عیسائی مذہب کی سخت مخالفت کی اور بعد کے رومی شہنشاہوں نے

عیسائیوں کو بہت تکالیف پہنچائیں اور ان کے چرچ جلادیئے۔ لیکن ۲۷۴ء تا ۳۰۳ء میں حالات بالکل تبدیل ہوگئے اور رومی شہنشاہ کانس ٹنٹائن نے عیسائی چرچوں کی تعمیر کرادی اور عیسائیوں کو تبلیغ کی آزادی دے دی۔ لیکن کانس ٹن ٹائن کے جانشین ڈایو کلے شین نے رومی سلطنت کو مشرقی اور مغربی صوبوں میں تقسیم کردیا۔ روم جو مغربی صوبہ میں تھا، وہ پوری سلطنت کا دارالسلطنت قرار پایا اور یہی عیسائیت کا اہم مرکز بن گیا اور اس صوبہ کی زبان لاطینی قرار پائی اور مشرقی صوبہ میں کئی عیسائی مراکز وجود میں آئے اور وہاں کی زبان یونانی قرار پائی۔ مشرقی صوبہ کا دارالسلطنت قسطنطنیہ قرار پایا۔ روم اور قسطنطنیہ کی عیسائی جماعتوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ یہاں تک کہ ۱۰۵۴ء میں دونوں نے باہمی تعلقات ختم کرلیے۔ لاطینی زبان بولنے والوں نے اپنے آپ کو رومن کیتھولک چرچ کا پیرو قرار دیا اور یونانی زبان بولنے والوں نے اپنے آپ کو رومن مشرقی آرتھوڈاکس چرچ کا پیرو قرار دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کے بارے میں بھی اختلافات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۵۱۷ء میں جرمنی کے ایک عیسائی پادری لوتھر نے پروٹس ٹینٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ رومن کیتھولک اور پروٹس ٹینٹ فرقوں میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ رومن کیتھولک فرقہ چرچ آف روم کے ماتحت رہا اور پروٹس ٹینٹ فرقہ چرچ آف انگلینڈ کے ماتحت رہا اور آج تک ہے۔ پھر آگے چل کر ان دونوں میں بھی تقسیم ہوئی اور دونوں کے اندر کئی فرقے ہوگئے۔

کلیسا کی کئی کونسلیں منعقد ہوئیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے بارے میں بحثیں ہوئیں۔ ان کونسلوں سے مراد عقائد و اعمال سے متعلق مسیحی

علماء کا مشاورتی اجتماع' تھا۔ یہ کونسلیں دو طرح کی ہوتی تھیں۔ایک عام کونسل جس میں تمام کلیساؤں اور مذہبی جماعتوں کی نمائندگی ہوتی تھی ، اور دوسری خاص کونسلیں جو کسی ایک فرقہ سے متعلق ہوتی تھیں۔

پہلی کونسل نیقیہ کی کونسل تھی جس سے عقیدۂ تثلیث کا آغاز ہوتا ہے۔اس کونسل میں یہ بحث شروع ہوئی کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف خدا کے رسول ہیں یا وہ ابن اللہ بھی ہیں۔اس کے بعد قسطنطنیہ کی پہلی کونسل ہوئی جس میں مسیح کی الوہیت اور ابنیت (یعنی بیٹا ہونے) کا اعلان کیا گیا۔اب ایک مسئلہ رہ گیا کہ روح القدس اور خدا میں کیا تعلق ہے۔اس کونسل میں روح القدس کی الوہیت کا اثبات کیا گیا۔اس کے بعد افسس کی پہلی کونسل ہوئی جس میں تثلیث کے عقیدہ کو اس طرح رائج کیا گیا کہ خدا باپ، خدا روح القدس اور خدا بیٹا۔لیکن اس کی وضاحت نہ ہوسکی کہ اقانیم ثلاثہ میں وحدت کیسے پیدا ہوتی ہے۔اور یہ بھی طے ہوا کہ مسیح کی دو فطرتیں ہیں، لاہوتی اور ناسوتی ۔ اس کے بعد قسطنطنیہ کی دوسری کونسل ہوئی۔ پھر تیسری کونسل ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ مسیح کی دو طبیعتیں اور دو مشیئتیں ہیں۔ پھر نیقیہ کی دوسری کونسل ہوئی جس میں مسیح اور دوسرے مقدسین کی تصویروں کی تقدیس و تعظیم اور ان تصویروں کا کلیسا، مقدس عمارات، گھروں اور راستوں پر رکھنے کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔

اس کے بعد قسطنطنیہ کی چوتھی کونسل ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ روح القدس ، باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے اور کلیسائے روم مسیحیت سے متعلق ہر چیز کے بارے میں ذمہ دار اور مستند ہے، اور اس کے بعد پانچویں کونسل ہوئی جس میں طے پایا کہ قسطنطنیہ کی چوتھی کونسل کی تمام قراردادیں باطل ہیں اور روح القدس کا

ظہور صرف باپ سے ہوا ہے۔

کلیساؤں کی درجہ بندی اس طرح کی جاسکتی ہے:

(۱) کلیسائے مصری جو اسکندریہ میں واقع تھا جس کا دار السلطنت قاہرہ تھا۔

(۲) مشرقی یونانی آرتھوڈاکس کلیسا جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا۔

(۳) پطرسی مغربی کلیسا جس کا مرکزی شہر روما تھا۔

اس کے بعد روما کی کونسل ۱۱۲۳ء میں ہوئی جس میں طے پایا کہ اساقفہ کا تعین پوپ کا کام ہے نہ کہ حکام کا۔ پھر ۱۲۱۵ء میں روما کی ایک اور کونسل ہوئی جس میں طے پایا کہ کلیسائے روم کے ہاتھ میں نجات ہے۔ وہ جس کو چاہے دے سکتا ہے اور یہ بھی طے پایا کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب مسیح کا گوشت اور خون ہوتا ہے۔

آٹھویں کونسل کے بعد کلیسا کی تقسیم ہوگئی۔ایک تھا مغربی لاطینی کلیسا جس کا نا کلیسائے پطرس تھا اور اس کا سربراہ تھا روما کا پوپ، اور دوسرا مشرقی یونانی کلیسا جس کا سربراہ قسطنطنیہ کا بطریق تھا۔ پھر ان دونوں کلیساؤں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔

چونکہ مسیحی نوجوان یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ کلیسا کی تعلیم انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتی، اس لیے دین مسیحی کی اصلاح کے لیے کئی اصلاحی تحریکیں اٹھتی رہیں۔کلیسا نے اپنی تعلیمات کے نفاذ میں جبر اور زبردستی کا طریقہ اختیار کیا اور علمی وسائنسی مباحثوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔اور اس جرم کا پتہ چلانے کے لیے باقاعدہ تفتیش کا محکمہ قائم کیا گیا۔کلیسا نے تمام مسیحی افراد پر ایک ٹیکس نافذ کر دیا اور اس کی وصولیابی

میں بدسلوکی کو بھی جائز رکھا جاتا تھا۔ یورپ کی راجدھانی روما میں سول ہزار پیشہ ور عورتیں تھیں جنہیں مالی فائدہ کی وجہ سے کلیسا کی سرپرستی حاصل تھی کیونکہ ان سے ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ کلیسا نے انجیل کی تفسیر اور فتوے دینے کا حق اپنے پاس رکھ کر دوسروں کو عقلی وفکری سرگرمیوں سے محروم کر دیا تھا۔

بارہویں کونسل جب ہوئی تو اس نے طے کیا کہ مسیح نے کلیسائے روم کو دستاویز نجات اور پروانۂ مغفرت دینے کا مجاز قرار دیا ہے، چنانچہ یہ ٹکٹ بے تکلف بیچے جانے لگے۔ مگر صلیبی جنگوں کے بعد جب مسیحیوں کو اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا، اور پادری یوحنا اور اس کے شاگرد جیروم نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ گناہوں کے دھونے میں کلیسا کو کوئی اختیار نہیں بلکہ خدا کی رحمت اور توبہ ہی گناہوں سے پاکی اور نفس کی پاکیزگی کا صحیح راستہ ہے اور کلیسا میں گناہوں کا اعتراف وغیرہ محض خرافات ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد لوتھر نے اپنی اصلاحی کوشش شروع کی۔ یورپ نے اس وقت کے بادشاہ کے توسط سے لوتھر کی شہریت کے حقوق چھین لیے۔ مگر سکونیہ کا حاکم لوتھر کا طرفدار تھا۔ اس کے باوجود بادشاہ نے اپنا حکم نافذ کرنا چاہا لیکن لوتھر کے ماننے والوں نے اسے اس سے باز رکھا اور احتجاج کیا، اسی لیے وہ پروٹسٹینٹ کہلاتے ہیں۔

لوتھر کے عقائد حسب ذیل تھے:

(۱) پوپ صرف ایک دینی شخصیت ہے۔ وہ حضرت مسیح کا خلیفہ نہیں ہے۔

(۲) کوئی دینی شخصیت اگر فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔

(۳) دینی اشخاص کی نیک چلنی کی خاطر لوتھر، ان لوگوں کی شادی پر زور دیتا ہے۔

(۴) رجال کلیسا کی طرف رجوع کئے بغیر ہر مسیحی کو انجیل سمجھنے کا حق ہے۔

(۵) عشائے ربانی مسیح کی خدا کاری کا نشان ہے۔ لیکن ان کی روٹی اور شراب کو مسیح کا جسم اور خون قرار دینا مضحکہ خیز بات ہے۔

اصلاحی تحریک کے نتائج

(۱) ان اصلاحی تحریکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپائے روم کی قیادت سے الگ کلیسے قائم ہوئے جنہیں پروٹسٹینٹ اصطلاح میں ''انجیلی کلیسا' کہا جاتا ہ۔ اس لیے کہ وہ اپنی تعلیمات انجیل مقدس سے حاصل کرتے ہیں۔

(۲) ایسے کلیسا کے سربراہ کے اقوال کو کتاب مقدس کا تقدس حاصل نہیں۔

(۳) کلیسا کی قیادت وعظ وارشاد اور ہدایت ونصیحت تک محدود ہے۔

(۴) مردوں پر مقدسین کی نماز اور ان کے لیے شفاعت کی مخالفت ہوگئی کیونکہ غفور صرف خدا ہے۔

(۵) نماز میں سمجھ میں آنے والی زبان کا استعمال جائز نہیں ہے۔

(۶) رہبانیت جائز نہیں کیونکہ اس سے معصیت پیدا ہوسکتی ہے اور رہبانیت دین کو خراب کرسکتی ہے۔

عیسائیت، زمانۂ حال میں حسب ذیل فرقوں میں تقسیم ہوگئی

(۱) ۱۹۲۵ء میں کناڈا میں یونائٹڈ چرچ آف کناڈا۔

(۲) ۱۹۳۸ء میں فرانس میں ریفارمڈ چرچ آف فرانس۔

(۳) ۱۹۴۱ء میں جاپان میں چرچ آف کرائسٹ۔ جاپان

(۴) ۱۹۴۶ء میں نیدرلینڈ میں ڈچ ریفارمڈ چرچ

(۵) ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں چرچ آف ساؤتھ انڈیا

(۶)۱۹۴۸ء میں جرمنی میں ریوین جیلیکل چرچ

(۷)۱۹۶۱ء میں امریکہ میں یونائٹڈ چرچ آف کرائسٹ

عیسائیت ہندوستان میں

جنوبی ہند کے عیسائیوں کے مطابق یہاں عیسائیت کی ابتداء کے سلسلے کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک شاگرد سینٹ تھامس کی ان تبلیغی کوششوں کے ذریعہ ہوا جوانہوں نے پہلی صدی عیسوی میں یہاں آ کرانجام دیں، اسی لیے جنوبی ہند کے عیسائی اپنی ابتداء کا سلسلہ سینٹ تھامس کی آمد سے ہی جوڑتے ہیں، سینٹ تھامس کی ان ہی کوششوں کے نتیجے میں جنوبی ہندوستان میں بہت سے چرچ قائم ہوئے۔ سولہویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے دوران آنے والی مسیحی تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ عیسائیت کے فروغ میں مزید اضافہ ہوا۔ چنانچہ آج ہندوستان میں دو کروڑ ستر لاکھ عیسائی آباد ہیں، جو کناڈا کی کل آبادی کے برابر ہیں، اس تعداد کے باوجود بھی عیسائی اس ملک کی کل آبادی کا تین فیصد 3% سے بھی کم حصہ ہیں۔

۱۵۰۵ء میں واسکوڈی گاما کے ساتھ آنے والے کیتھولک مشینریز کا ایک اثر یہ پڑا کہ یہاں کے عیسائیوں کی عبادات اور رسومات میں بعض تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے دوسو سال بعد یہاں کے چرچ رہنماؤں کو نو وارد انگریز مشینریز کے ذریعہ اپنی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں، چناچہ اس کے بعد چرچ سے متعلق با قاعدہ ایک اصلاحی تحریک کا سلسلہ خود چرچ سے شروع ہوا، جس کے نتیجہ میں ان کے عقائد کے بنیادی تصورات میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔

جنوبی ہند کے عیسائیوں میں روز اول سے ہی ایک مضبوط ملی احساس پایا جاتا ہے جو آج بھی ہے ان کی تاریخ تقریباً دو ہزار (۲۰۰۰) سال پرانی ہے، اور یہ لوگ چرچ سے تعلق کو اپنے لیے باعث فخر محسوس کرتے ہیں، یہ لوگ ملک کی مختلف سماجی، تبلیغی، فلاحی تحریکات میں ہمیشہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

یہاں کی غربت اور یہاں کا افلاس ہندوستان میں مسیحی تبلیغی جماعتوں کی آمد کی اصل وجہ تھے، جن لوگوں نے ان کوششوں سے عیسائی عقائد قبول کئے ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو اپنے ابتر معاشی حالات سے پریشان تھے، یا پھر وہ لوگ تھے جنہیں خود اپنے ہی سماج میں کوئی حیثیت یا مرتبہ حاصل نہیں تھا، ان حالات سے صرف بڑے بوڑھے ہی نہیں بلکہ بچے بھی پریشان رہتے تھے، اسی لئے بہت سے وہ لاوارث اور بے سہارا بچے بھی جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا ان عیسائی جماعتوں کی دعوت قبول کر لینے پر مجبور تھے۔

۱۹۳۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ان سارے مذہب تبدیل کرنے والوں میں 80% ایسے لوگ تھے جن کی ضروریات مسیحی تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ ہی پوری ہوتی تھیں، دھیرے دھیرے ان سارے لوگوں پر ان کے نئے مذہب کا رنگ اس طرح غالب آتا گیا کہ یہ لوگ اپنی پرانی تہذیبی اور تمدنی روایات سے نہ صرف دور ہوتے گئے بلکہ اپنے ہی علاقوں میں اجنبی بنتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان نئے عیسائیوں کے متعلق یہ تصور قائم ہونے لگا کہ ان کی وفاداریاں بیرونی ممالک اور وہاں کی تہذیبوں سے وابستہ ہوگئیں ہیں۔ ان تمام تبدیلیوں کو اس ایک واقعہ کی مدد سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

چرچ کے ایک افسر کے مطابق ایک قبائلی اس کے پاس آیا اور کہا کہ ”میں

نے اپنے بال کٹوا لیے ہیں، اور پتلون پہننے لگا ہوں عیسائی بننے کے لیے مجھے اور
کیا کرنا ہوگا۔"

ہندوستان کو کہ جہاں 83% ہندو آباد ہیں اسے اقلیتوں کا ملک کہنا چاہیے،
کیونکہ ۲۲رکروڑ مسلمات ساتھ کروڑ قبائیلی، ۶رکروڑ سکھ اور لاکھوں ان گنت
دوسری بہت سی قومیں یہاں آباد ہیں، جن میں سے ہر گروپ ہندوستانی
جمہوریت میں ایک ووٹ بینکر یا بلاک کی حیثیت رکھتا ہے، مگر عیسائی اپنی کم
تعداد کی وجہ سے اس جمہوری نظام یا اس کے رہنماؤں کی نظر میں وہ اہمیت نہیں
رکھتے جو دوسروں کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی حکومت کے بعض
پروگراموں میں عیسائیوں کے لیے وہ فراخ دلی نہیں نظر آتی جو آنی چاہیے۔ مثلاً
حکومت ہند نے بعض قوموں کے لیے ملازمتوں اور داخلوں میں باقاعدہ سیٹوں
کا جو تحفظ کر رکھا ہے ان میں نیچی ذات والوں کو ترجیح دی جاتی ہے، مگر عیسائی
ہوجانے کی وجہ سے ان کا اپنی اصل قوم سے واسطہ سمجھا جاتا ہے، اسی لیے ان
مراعات حاصل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ درخواست میں اپنی
اصل ذات کا اندراج بھی کریں ج س کی وجہ سے عیسائیوں کو دشواری ہوتی ہے،
ان تمام وجوہ کی بنا پر ہندوستانی عیسائی یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں سرکاری
نوکریوں اور ان میں ملنے والی ترقیوں میں برابر کے مواقع حاصل نہیں ہیں،
جب کہ عیسائیوں کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ لوگ اوروں کے مقابلہ میں
زیادہ محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں۔

بظاہر ان تمام نامساعد حالات کے باوجود عیسائیوں کو صحت عامہ اور تعلیمی
کاموں میں ایک قائدانہ حیثیت حاصل ہے۔ عیسائی ڈاکٹروں اور نرسوں کی

تعداد پر اگر غور کیا جائے تو ملک کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دوسروں کے
مقابلہ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، ایک اندازے کے مطابق ملک کل نرسوں
میں ۳۰رفیصد عیسائی نرسیں ہیں۔ عیسائیوں کے ذریعہ چلائے جانے والے
اسپتالوں، تعلیمی اداروں وغیرہ کا معیار بھی دوسرے اداروں کے مقابلہ میں بہتر
تصور کیا جاتا ہے۔

غیر ملکی مسیحی تبلیغی جماعتیں اور ان کے ذمہ دار بھی ہندوستانی عیسائیوں کے
ان کاموں میں نہ صرف پوری دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اس کی پوری کوشش کرتے ہیں
کہ اکی کارکردگی بہتر سے بہتر رہے۔

ملک کے شمال اور جنوبی حصہ کے عیسائیوں کی حالت کا موازنہ کرتے وقت
یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ جنوبی ہند کے عیسائیوں کی حالت شمال حصہ
کے عیسائیوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے، اس کی بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ جنوبی
ہند کے عیسائیوں نے تبدیلئ مذہب کے باوجود بھی اپنے رہن سہن یا اپنے تہذیبی
وتمدنی قدیمی رشتوں کو دوسری قوموں سے ٹوٹنے نہیں دیا، اسی لیے وہ آج بھی
اپنے رہن سہن میں ان کا حصہ ہی نظر آتے ہیں۔ جب کہ شمال ہند کے عیسائیوں
کو اپنا وجود باقی رکھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہے، اسی لیے اس علاقے کے
چرچ کے ذمہ دار بھی اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ شمالی ہند کے یہ عیسائی
کسی طرح اپنا وجود باقی رکھ سکیں۔ مال ہند کے عیسائی ہمیں قومی کاموں میں اس
طرح آزادانہ حصہ لیتے نظر نہیں آتے جس طرح جنوبی ہند کے عیسائی نظر آتے
ہیں، جنوبی ہند کے ایک عیسائی لیڈر کے قول کے مطابق شمال کے عیسائیوں کے
لیے ان کا مغربی لباس زیب تن کرنا، انگریزی بولنا اور گائے کا گوشت کھانا ی

شایدان کی شناخت کے لیے کافی ہے۔

شمال ہند کے عیسائیوں کی اس حالت کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار ہیں، اس لیے کہ تبدیلئ مذہب کے بعد انھوں نے اپنے رہن سہن اور اپنے قدیمی تہذیبی رشتوں کو اپنی اصل قوم سے باقی نہیں رکھا، جب کہ جنوبی ہند کے عیسائیوں نے ایسا نہیں کیا اسی لیے وہ آج ان سے زیادہ مطمئن اور بہتر حالت میں نظر آتے ہیں۔

اسلام

مذہب اسلام کی ابتداء حضرت آدم کی پیدائش کے وقت سے ہی مانی جائے گی، اور ان کے بعد جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں بھیجے گئے، وہ سب اسلام ہی کی تعلیم دیتے رہے۔ مگر ہر پیغمبر کے زمانے کی شریعت الگ الگ نافذ کی گئی، کیونکہ اس میں زمانے کے حالات اور انسانی ذہن کی ساخت کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں، شاید اسی لیے بعض محققین نے اسلام کا سامی روایات سے تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو اس لحاظ سے صحیح ہو کہ خود قرآنِ کریم میں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً بعض آیات میں اسلام کو دین ابراہیمی اور پیغمبرانِ بنی اسرائیل کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق کہا گیا ہے۔(۱)

اب اگر ہمیں ان پیغمبروں کے ماننے والوں یعنی یہود و نصاریٰ اور اسلامی تعلیمات کے درمیان کچھ اختلاف نظر آتا ہے تو وہ قرآنی نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہود و نصاریٰ کی بعد کی بدعات اور تحریکات کا نتیجہ ہیں۔

لفظ اسلام پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس کے معنی خود سپردگی اور اطاعت و فرمانبر داری یا تسلیم و رضاء کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اپنے ان معنوں کے ساتھ کئی مقام پر استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱۱، اور ۱۱۲ میں انہیں

---

(۱) سورہ الشوریٰ کی ۱۳ویں سورہ البقرہ کی ۱۴۰ویں اور ۱۳۵ویں آیات

معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی اسلام قبول کر لینے کے ساتھ ہی انسان اس سارے نظام اور قوانین پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو شریعت اسلامی کہلاتی ہے، اور جس کا دائرۂ اثر عبادات سے لے کر خاندانی و سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کے مختلف میدانوں تک پھیلا ہوا ہے۔

بنیادی عقائد اور تعلیمات

قرآن کریم کا مرکزی موضوع توحید ہے، جو کائنات میں خدا کی فطرت کے مختلف مظاہر کے ساتھ ساتھ اس کی قدرت اور حکومت پر استدلال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا اقرار کرنے والے بنیادی کلمۂ طیبہ کا پہلا آدھا حصہ یعنی ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' میں توحید کا واضح اعلان کیا گیا ہے (نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں) یعنی سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت، لائق پرستش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقائد میں توحید کو قولی، قلبی اقرار کو اول مقام حاصل ہے۔

قرآنِ پاک اپنے دلائل و نظائر میں جہاں کارخانۂ قدرت اور ذاتِ انسانی کو نشانِ راہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، وہیں انسانی روح میں خدا کی ہستی کے پوشیدہ احساس کو جگاتا ہے، نیز تمام فطرت اور انسان کا ذاتِ الٰہی پر مکمل انحصار اور اس کے مطیع و محکوم ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ انسانوں کو خدا کی قدرت کی مختلف نشانیوں کی طرف انسانوں کو متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ، ان کی ارواح میں دبے ہوئے فطری احساس کو جگانے کی ذمے داری جن ہستیوں کو سونپی جاتی رہی ہے، وہ اپنے اپنے ادوار اور اپنی اپنی اقوام کے پیغمبروں کی ذات رہی ہے، کہ جنھوں نے نفسانیت اور غیر اللہ سے منہ موڑ کر خدا سے تعلق استوار کرنے کی تلقین

کے ساتھ ساتھ خدا کی مرضی اور اس کی منشاء کو بھی واضح کرنے کا کام کیا، یہاں تک کہ تمام انسانوں اور پوری دنیا کی ہدایت کے لیے اس سلسلہ کے آخری رسول اور پیغمبر کی صورت میں ہمارے آقا اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے، اور وحی آسمانی و ہدایت الٰہی کے ذریعہ تمام انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچانے کا اہم کام انجام دے کر دینِ اسلام کو فروغ دیا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس عقیدہ پر اصرار کرتا ہے کہ اسلام لانے والے ہر فرد کو حضور ﷺ کی رسالت کے علاوہ ان سے پہلے آئے ہوئے تمام پیغمبروں کی رسالت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، نیز ان پر نازل ہونے والی کتابوں کی حقانیت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ توحید و رسالت کے علاوہ اسلام کے بنیادی عقائد میں آخرت، ملائکہ اور تقدیر پر بھی ہر مسلمان کو ایمان لانا ضروری ہے۔ ان بنیادی عقائد کے علاوہ اور بھی ایسے عقائد ہیں جو ایک مسلمان کے صحیح اسلامی عقیدہ کا جز تسلیم کئے گئے ہیں، جیسے عذابِ قبر، پل صراط، قبر میں سوال و جواب، حوض کوثر، شفاعت، اصحاب رسول کی بزرگی کا اعتراف اور قیامت میں دیدار الٰہی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی تعلیمات ہیں جن پر قرآن و حدیث میں زور دیا گیا ہے اور انہیں بھی اسلامی تعلیمات کا جز قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی روایات اور تمدن کا ارتقاء

ان تمام تعلیمات کے علاوہ قرآن کے بعض احکامات اور تعلیمات مذہب کے اس پہلو سے تعلق رکھتی ہیں جن کو ''عبادات'' کہا جاتا ہے، جن میں قرآن و حدیث کے مطابق توحید کا زبان و قلب سے اقرار کرنے کے علاوہ نماز، روزہ،

حج اور زکوٰۃ خاص ہیں۔ اسلام میں عبادات کا مقصد خدا کے سامنے اپنی عبدیت اور بندگی کا اظہار اور اعتراف کرنا ہے۔ ان عبادات کو حقوق اللہ کہا گیا ہے۔ قرآن اور اسلام نے تقدیر انسانی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس میں انسان کو بحیثیت فرد ایک مرکزی مقام حاصل ہے، اور اس کے اعمال کی ذمے داری، اس کا حساب و کتاب جنت و دوزخ یا اس کی تقدیر کا فیصلہ، یہ سب انفرادی طور پر ہی ہوگا، لیکن انسان اپنے اس مقدر تک سماج کے ذریعہ یعنی سماج میں رہ کر اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ہی پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ سماجی زندگی کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ سماج افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ سماجی یا اجتماعی زندگی اس میں موجود افراد پر اثر انداز ہوتی ہے، اسی لیے فرد و سماج کے درمیان ایک ایسا ربط یا تعلق ہوتا ہے جس میں وہ ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ نے قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق پاک خاص طرح کے سماج کی تشکیل کے لیے جو جدوجہد کی تھی، اپنی مدنی زندگی کے آخر تک اس میں انہیں کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ ادھر مشرکین مکہ خاص کر قریش کے ظلم وستم کے رویے نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کو سکون سے نہ رہنے دیا، اور مدنی زندگی کے آخری زمانے تک حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ رکھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے منظم و مستحکم ہونے میں بہت مدد ملی۔ شہر اسلام میں ابتداء ہی سے مذہب اور سیاست کا ایسا اجتماع ہوگیا تھا جس نے آئندہ اسلامی تاریخ پر اپنے بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ حضور ﷺ کے وصال کے وقت مدینہ میں ایک مخصوص معاشرہ اور ایک خود مختار ریاست اپنے بنیادی خدوخال میں واضح شکل اختیار کر چکی تھی۔

حضور ﷺ کی رحلت کے بعد مسلم اکثریت کے نزدیک ان کی روحانی جانشینی کا کوئی سلسلہ قائم نہیں ہوا، مگر شیعہ حضرات کے نزدیک آپ کی روحانی جانشینی امامت کی صورت میں ایک عرصہ تک قائم رہی۔ شیعہ فرقوں میں زیدیہ کے نزدیک چھٹے امام، اور اسمٰعیلیہ کے خیال کے مطابق ساتویں امام اور اثنا عشری شیعہ کے خیال میں بارہویں امام تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ حضور ﷺ کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے پہلے چاروں جانشین جو خلفائے راشدین کے نام سے موسوم ہیں، اسلامی تعلیمات کے مثالی پیرو اور مسلم معاشرہ اور ریاست کو اسلامی انداز پر چلانے والے عظیم رہنما تھے۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنھوں نے بالترتیب دو سال تین مہینے گیارہ روز، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دس سال چھ مہینے پانچ روز، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے گیارہ سال گیارہ مہینے اور اٹھارہ روز اور حضرت علی کرم اللہ وجہ نے چار سال آٹھ مہینے اور اٹھارہ روز ریاستِ مدینہ کی رہنمائی کی ذمہ داریاں نبھائی ں۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکل کر آس پاس کے ممالک فتح کرتے ہوئے مشرق میں ترکستان اور مغرب میں شمالی افریقہ کے وسیع علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ خلافت راشدہ کے آخری دس سالوں میں مسلمانوں کے آپسی اختلافات اور لڑائی جھگڑوں نے فتوحات کے اس سلسلے کو وقتی طور پر روک دیا تھا، مگر جب ۶۶۱ء میں بنوامیہ کے ہاتھوں میں اقتدار آیا تو مسلم ریاست کی فتوحات کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا، اور بنو امیہ کے چھٹے حکمراں ولید بن عبدالملک کے دور میں مسلمانوں نے مشرق میں چین و ہندوستان، شمال میں قفقاز اور مغرب میں جنوبی فرانس تک اسلامی ریاست کی حدود کو پہنچا دیا۔ بنو

امیہ کی حکومت ۶۶۱ء۔۷۵۰ء تک قائم رہی۔ ان کے نظام حکومت نے اس وقت دنیا کے سامنے ایک بے مثل نظام پیش کر کے دوسری قوموں پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ ان کے نظام حکومت نے اس وقت دنیا کے سامنے ایک بے مثل نظام پیش کر کے دوسری قوموں پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ ان کے دورِ حکومت میں اسلامی تہذیب وتمدن نے جو منزلیں طے کیں وہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبے اور تہذیب وتمدن کے ہر میدان میں مسلم معاشرے نے ان قدیمی تہذیبی روایتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جو اس کے دائرۂ اثر میں آرہی تھیں۔ غرض اس سارے میل جول نے ایک ایسی معیاری تہذیب کو جنم دیا جو تقریباً آنے والے ایک ہزار سال تک تمام دنیا کے لیے ایک چمکتے ہوئے نمونے کا کام کرتی رہی۔ مذہبی روایات میں ارتقاء کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو عہد بنو امیہ میں علم فقہ، حدیث، تفسیر اور سیرت وغیرہ کی جمع وتدوین کا کام بڑے پیمانے پر ہوا، ساتھ ہی مفتوحہ ممالک میں دوسرے مذاہب والوں اور یونانی علوم سے متاثر روایات سے اسلامی روایات کا اختلاط بھی شروع ہوا، جس کی وجہ سے بہت سے دین سے وابستہ مسائل بڑی شدت سے سامنے آئے۔ خلافتِ راشدہ کے تیسرے عہد، یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں مسلمانوں میں جو سیاسی گروہ بندیوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس کے نتیجہ میں کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آگئیں، جن میں شیعہ اور خوارج خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کی سیاسی واجتماعی گروہ بندیاں، ان کے مخصوص عقائد جیسے اور بہت سے خارجی عوامل، وہ اسباب تھے جو بڑی حد تک اسلامی معاشرے میں فکری ہیجان پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے، نیز مفتوحہ علاقوں

کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے عرب مسلمانوں اور غیر عرب مسلمانوں، دونوں کو نئے نئے فقہی مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، جن کے لیے قرآن وحدیث کی روشنی میں براہ راست کوئی حکم موجود نہیں تھا، اس وجہ سے مسلمانوں کو قرآن وحدیثکی روشنی میں اپنی ذاتی قوت فیصلہ کا استعمال کرتا پڑا، اور یہی صورت حال مختلف فقہی مکاتب فکر کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔

عہد بنو امیہ میں بیرونی اثرات کی وجہ سے آزاد خیالی اور عقلیت پسندی کے جو رجانات پیدا ہوئے تھے، عہد بنو عباس میں وہ اور شدت اختیار کر گئے۔ اسلامی سماج میں علمی ذوق رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوا جو فلسفیانہ طرز فکر اور عقلی بنیادوں پر چیزوں کے پرکھنے پر یقین رکھتا تھا، اسی لیے وہ ایسے ماخذ کا طلب گار تھا جن کی مدد سے حقائق کو عقلی بنیادوں پر پرکھا جا سکے۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پُرانی یونانی کتب کے عربی تراجم کا سلسلہ شروع ہوا، اور یہ ترجمے پہلے سُریانی، آرامی، عبرانی اور فارسی میں ہوئے۔ اسلام سے پہلے بھی بہت سا علمی سرمایہ یونانی سے ان زبانوں میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ وقت گزرنے ساتھ ساتھ بعد میں ایسے بھی مترجمین پیدا ہو گئے جو یونانی سے براہ راست عربی میں ترجمہ کرنے لگے۔ ان تمام حالات کے نتیجے میں باقاعدہ ایک عقلیت پسندی کا منظّم گروہ معتزلہ کی شکل میں سامنے آیا۔

ترجمہ کے اس کام کو فروغ دینے میں عباسی حکمرانوں میں ابو جعفر منصور، ہارون الرشید، اور مامون الرشید کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے ادوار میں علمی سرپرستی اور علم وعلماء دوستی کی بے مثال خدمات انجام دی گئیں، یہی وجہ تھی کہ ان کے دربار مختلف علوم وفنون کے ماہرین سے بھرے رہتے

تھے،جنہیں ہرطرح کی سہولیات دربار کی طرف سے میسر تھیں۔اسی لیے عباسی دور کو علمی ،تہذیبی اور تمدنی وثقافتی ترقی کا دور کہا جاتا ہے،علم حدیث،تفسیر،فقہ، نحو وصرف اور دوسرے دینی علوم کے علاوہ بہت سے سائنسی علوم جیسے علم کیمیا،طبیعیات، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ،فلسفہ،منطق،علم طب وغیرہ کو بھی اس دور میں زبردست فروغ حاصل ہوا،آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک ایسے اشخاص سماج میں ملنے لگے تھے کہ جن کے ذریعہ مذہب کا روحانی پہلو، جو تقریباً دب کر رہ گیا تھا، اُجاگر کیا جانے لگا، یہاں تک کہ دسویں صدی عیسوی تک تصوف نے باقاعدہ ایک روایت کی شکل اختیار کرلی تھی،اس سلسلہ میں حسن بصری۔ابراہیم ادھم،فضل بن عیاض اور معروف کرخی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔سری سقطی،ابوسعید الخراز کا شمار صوفی مصنفین میں ہوتا ہے،جن کی تصانیف نے تصوف کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

ایک وقت وہ آگیا کہ علماء وصوفیاء کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج پریشانی کا سبب بن گئی جس کی بڑی حد تک ذمہ دار صوفیانہ تصورات کی خلاف شرع وہ مختلف شکلیں تھیں جو معاشرے میں رائج ہوچکی تھیں،گیارہویں صدی کے مصنّفین مثلاً ابوطالب مکی، السراج، امام قشیری، اور شیخ علی ہجویری نے جہاں اپنی تصانیف کے ذریعہ تصوف کی صحیح تشریح راسخ العقیدگی کے معیاروں کو سامنے رکھ کر، نیز خلاف شرع باتوں کو رد کرتے ہوئے صوفیانہ تصورات کی زبردست خدمت کا کام کیا،تصوف میں ان مثبت کوششوں کو اس وقت ایک بڑی طاقت مل گئی جب امام غزالی نے شریعت اور تصوف میں ایک ایسا گٹھ جوڑ پیدا کرنے کی کوشش کی کہ نہ صرف پچھلے تمام خدشات دور ہوگئے بلکہ ان کے خیالات نے مسلمانوں کی

مذہبی فکر پر ایسا گہرا اثر ڈالا کہ آج تک اسلامی روایت انہیں کی تشریح وتعبیر کی حامل ہے۔انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ مذہب اسلام کی ایسی تعبیر پیش کی جس کے مطابق شریعت اگر جسم ہے تو تصوف کو اس کی روح ثابت کیا، اور اس طرح دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار دیا۔اس طرح انہوں نے دینی علوم میں روحانیت کی جان ڈال دی یہی وجہ تھی کہ امام غزالی کے بعد علمائے دین میں تصوف کو وہ فروغ حاصل ہوا کہ یہ لوگ کسی نہ کسی کے مرید اور اکثر مستند صوفی بزرگ عالم دین ہوتے ہیں۔نیز امام غزالی کی شخصیت،خیالات اور ان کی تصنیفات نے مسلمانوں کے مذہبی افکار پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ آج تک اسلامی روایت انہیں کی تعبیر وتشریح کی حامل ہے۔

ظہور اسلام کے ساتھ جس تہذیبی عمل کا آغاز ہوا تھا اس کی معراج روحانیت کو اپنا مقصود بنا کر حاصل ہوئی، اور پھر مسلم سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہ رہا جو تصوف کے اثر سے بچ گیا ہو، شاہ وگدا، عوام وخواص مرد وعورت،غرض پورا معاشرہ اسی رنگ میں رنگ گیا تھا۔

عہد وسطیٰ کے مسلم سماج میں تصوف کے اس مختصر ذکر کے بعد ضروری ہے کہ اس دور میں ہم ان علوم وفنون کا بھی ذکر کرتے چلیں جو اس دور کے تہذیبی عمل میں شریک رہے۔اس دور میں مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم نے صرف عقلیت کے رجحان کو ہی ترقی نہیں دی تھی بلکہ ان میں نئی نئی جستجو کا مذاق بھی پیدا کردیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ خلیفہ منصور کے دور میں ابراہیم فرازی، الخوارزمی نے علم ریاضی اور علم ہیئت میں لاجواب تحقیقات کے ساتھ ساتھ ہندسوں کو عرب دنیا میں متعارف کروا کر مسلمانوں کے لیے ترقی کی راہ ہموار کردی۔علم ریاضی، علم

کیمیاء، علم طبیعیات، جغرافیہ، تحقیقات وتصنیفات کے ذریعہ وہ بے مثال کا
رنامے انجام دیے کہ دور جدید کی طبی وسائنسی تحقیقات کے لیے وہ کارنامے
بنیاد بن گئے۔

بین الاقوامی تجارت کے فروغ کی خاطر نئے بحری راستوں کی تلاش نے
علم جغرافیہ کو نئی سے نئی معلومات سے مالا مال کیا۔ یعقوبی، مقدسی، الادریسی وغیرہ
نے اپنی تحقیقات اور دور دراز کے اسفار کے ذریعہ بہت سی جغرافیائی معلومات کا
احاطہ کیا، علم طب میں مسلمانوں کی دلچسپی اس کے فوائد کی وجہ سے بنی امیہ کے
دور سے ہی قائم تھی۔ اس علم کی بعض کتابوں کا ترجمہ بھی اس دور میں ہوا، مگر اس
فن میں صحیح معنوں میں ترقی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب مامون الرشید نے
جالینوس کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرایا۔ ابوبکر الرازی اس علم کا وہ پہلا ماہر ہے
جس نے ہندوستانی، ایرانی اور یونانی طبی ورثہ کو اپنی کتابوں میں جمع کیا بلکہ اپنی
نئی تحقیقات اور تجربات کے ذریعہ اس علم میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا۔ بغداد میں
اسپتالوں کے قیام کا سلسلہ ابوبکر الرازی کی دین تھی۔ یہ اسپتال علاج ومعالجہ کی
جگہ کے علاوہ نوجوان طبیبوں کی تربیت گاہ بھی تھے۔ الرازی نے فن طب پر تقر
یباً دوسو کتابیں تصنیف کیں۔ رازی کے علاوہ علی عباس مجوسی، ابن النفیس، حسین
بن علی ابی سینا نے علم طب میں اپنی تحقیقات وتصنیفات کے ذریعہ وہ بیش بہا
خدمات انجام دیں کہ آج تک دنیا انہیں ان علوم کا موجد اور رہنما تسلیم کرتی
آرہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات کو مغرب کی بہت سے زبانوں نے
دیگر عقلی علوم، علم کیمیا، علم نجوم، علم الحیوان، علم نباتات اور علم جراحی کو جابر بن
حیان، ابومشعر، ابوعثمان، الجاحظ، البیرونی، وغیرہ نے اسلامی معاشرہ میں نہ صرف

رائج کردیا تھا، بلکہ ان کی تصانیف سے متاثر ہو کر ایسے محققین پیدا ہوتے رہے
جنہوں نے صدیوں تک مسلمانوں کو ان علوم کا امام بنائے رکھا۔

مسلمانوں میں علم تاریخ کی ابتداء سیرت نگاری اور مسلمانوں کے ابتدائی
تاریخی حالات کو اکٹھا کرنے سے ہوئی، صحابہ کے حالات کے علاوہ بنوامیہ کے
حالات، ان کا انتظام سلطنت، فتوحات کے سلسلہ میں ایرانی، رومی اور دوسری
قوموں کے حالات کی جانکاری کے علاوہ قرآن میں مذکور یہود ونصاریٰ قوموں کی
تاریخوں کی معلومات وغیرہ سے دلچسپی لینے کے نتیجہ میں مسلمانوں کو ابتداء ہی سے
علم تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی،
یہاں تک کہ اس فن میں ہر دور میں بہت ساری کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

مسلمان مؤرخین میں ابن جریر الطبری کو علم تاریخ میں اولیت حاصل ہے،
جس نے اپنی کتاب تاریخ الرُسل والملوک میں پوری صحت کے ساتھ دنیا کی
ایک مکمل تفصیلی تاریخ پیش کی ہے۔ اس فن میں طبری کے بعد دوسرا اہم نام
ابوالحسن علی المسعودی کا آتا ہے، جس نے اپنے ایشیا اور افریقہ کے سفر کے بعد
ساری تاریخی معلومات کو اپنی تیس تاریخی تصانیف میں مختلف عنوانات کے تحت
محفوظ کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبری اور مسعودی کے ذریعہ مسلمانوں میں علم تاریخ
اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا، بعد کے مؤرخین انہیں کے طرز کو اپنا کر تاریخ نگاری کو آ
گے بڑھاتے رہے ہیں۔

□□□